دل کی وادیاں سو گئیں

کرشن چندر

ناول

دل کی وادیاں سو گئیں!

ایشیا کے بے مثل فن کار کا ایک

ناول

قیمت :

ے

کرشن چندر ایم اے

دل کی وادیاں سو گئیں

ایک ناول

مُون لائٹ بکڈپو

چوک انارکلی لاہور

محمد یونس پرویز نے نامی پریس لاہور سے چھپوا کر
مون لائٹ بکڈپو لاہور سے شائع کیا۔

دیباچہ

اس ناول کے مرکزی خیال کا آغاز میرے عزیز دوست ریش سہگل سے ایک بحث کے دوران میں ہوا۔ وہ ریلوے ٹرین کے حادثے کو ایک موضوع بنا کر اس پہ ایک فلم چاہتے تھے۔ میں نے کہا ریلوے ٹرین میں ایک مسافر نہیں۔ بارہ تیرہ سو مسافر سفر کرتے ہیں۔ اس لئے ایک نہیں۔ اس موضوع پر تو بارہ تیرہ سو کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں اتنے ہی ناول اور اتنے ہی فلم تیار ہو سکتے ہیں۔ وہ بولے تم ناول لکھو میں اسے فلماؤں گا۔ ناولوں کے امکانات پر بھی بحث رہی۔ میں نے انہیں ٹھاکر پوچھی کا ایک افسانہ سنایا۔ جو ریلوے ٹرین کے ایک حادثے سے متعلق تھا۔ لیکن انہیں اس کا کینوس بہت مختصر معلوم ہوا۔ انہوں نے مجھے بنگالی مصنف بن پھول کا افسانہ سنایا۔ لیکن مجھے اس کا سماجی پس منظر پسند نہیں آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ناول لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن چند باب

لکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے اور رمیش کے نقطۂ نظر میں بہت بُعد ہے۔ وہ ایک ہلکی پھلکی کامیڈی چاہتے ہیں۔ مجھے کامیڈی ٹریجڈی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں ایک سماجی تصویر چاہتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ فلم کا ہیرو متوسط طبقہ کا ایک پریشان خیال نوجوان ہے۔ میں نے کہا وہ متوسط طبقہ کا ہو سکتا ہے۔ نوجوان بھی ہو سکتا ہے۔ پریشان خیال بھی۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن آخر میں اس کی پریشان خیالی میں کچھ تو کمی ہونی چاہیے ہم لوگوں کو کیا دیں گے؟ میں کچھ ایسا چاہتا تھا کہ ریلوے ٹرین میں جو مختلف طبقوں سے افراد مختلف درجوں میں سفر کرتے ہیں، انہیں ایک ایسے مقام پر لا کر پہنچ دیا جائے جہاں وہ اپنے طبقے کے بنیادی عادات و خصائل کو بے نقاب کرنے پر خود بخود مجبور ہو جائیں۔ جو باز دروازے دباؤ کے زیر اثر کچھ اپنے آپ کو بدلیں بھی اور جب وہ خارجی دباؤ دور ہو جائے تو پھر ان خصلتوں کو دوبارہ اختیار کر لیں جس طرح نہانے کے بعد وہ اپنا لباس پہن لیتے ہیں۔ میں اس لئے ایسا چاہتا تھا تا کہ پڑھنے والوں کو سماج کی جڑیں اپنی اصلی حالت میں دکھائی دینے لگیں۔

لیکن رمیش اپنی بات پر اڑے رہے وہ فلم میں اس حد تک آگے بڑھنے کو تیار نہیں تھے۔ اس لیے میں نے ان سے کہا۔ اب تم اپنے ڈھنگ سے اپنا فلم بناؤ میں اپنے خیال کے مطابق اپنا ناول لکھوں گا۔ دونوں ایک ہی ٹرین سے سفر کرتے ہیں مگر الگ الگ اپنی منزل کو جاتے ہیں ———— یہ ناول اسی بحث کا نتیجہ ہے۔

کرشن چندر

پہلا باب

وہ گاڑی کی کھڑکی کے قریب اکڑوں بیٹھا تھا اس حالت میں دیکھ کر کوئی اس کے لانبے قد اور گٹھیلے جسم کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا اس کے چہرے پر تین چار روز کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور اس کے سر کے بال اس طرح سیدھے تنے کھڑے تھے جیسے برش کے سوراخوں میں پھنس گئے ہوں۔ اس کے فراخ ماتھے پر پریشانی کی لکیریں تھیں جو دونوں ابروؤں کے بیچ میں زیادہ گہری ہو گئی تھیں۔ جب وہ اپنے مضبوط جبڑوں اور ٹھوڑی پر بڑھی ہوئی داڑھی کو کھجانے لگتا تو اس کے ہاتھ میں پڑی ہتھکڑیاں زور سے بج اٹھتیں۔ گاڑی کے مسافر دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے اور پھر اس کی کٹیلی آنکھوں کی تیز تیز چمک سے گھبرا کر نگاہیں پھیر لیتے۔ اب وہ ان نگاہوں کا عادی ہو گیا تھا۔ یہ نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹ کر اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے پولیس کے سپاہی کے چہرے پر گڑ جاتیں۔

پولیس کے سپاہی نے اپنا سر منڈا رکھا تھا۔ اور اس کے گورے کشادہ چہرے پر ایک بڑی ہی خوبصورت بھوری داڑھی تھی۔ اس کے خمیدہ سرخ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔ اس کا چہرہ اس قدر نورانی تھا کہ اگر اس نے پولیس کی وردی نہ پہنی ہوئی ہوتی تو لوگ اسے ولی یا پیغمبر سمجھنے پر مجبور ہو جاتے۔ مگر وہ ایک معمولی پولیس مین تھا۔ اور اپنی پارعب وردی باوجود اندر سے ایک سیدھا سادھا معمولی آدمی تھا۔ اس نے زندگی میں جھوٹ بھی تھے کئی ایک چھوٹے موٹے جرم بھی کئے تھے۔ جو قانون کی نظروں میں نہ آسکے تھے۔ اس نے اپنی ترقی کے لیے خوشامد بھی کی تھی۔ افسروں کو رشوت بھی دی تھی۔ اُن کی گھڑکیاں اور لاتیں بھی کھائی تھیں۔ اور اس کا غصہ اس نے حوالات کے محبوس قیدیوں پر بڑی بے دردی سے اتارا تھا۔ پھر گھر جا کر بیوی سے پیار بھی کیا تھا۔ بچوں کو مٹھائی دی تھی۔ نماز پڑھی تھی۔ روکھی سوکھی کھا کر دو نفل شکرانے کے ادا کئے تھے۔ اور جانوروں کی طرح اپنی تنگ و تاریک کھولی میں سو گیا تھا۔ جس کے گرد ایسی ہی اور سینکڑوں کھولیاں اور ڈربے تھے۔ مجبور زندگی کی چھوٹی چھوٹی بلائیں جہاں مسرت گناہ تھی اور تمنا ایک جرم۔ اور ہر امنگ کے سامنے ایک سینخچہ تھا۔ جو آسمان کو اندر آنے سے روک رہا تھا۔ آدمی آسمان سے اس قدر کیوں ڈرتا ہے۔

پولیس کے فرشتے نے مٹی کی ٹھلیا سے پانی کا ایک گلاس انڈیلا اور پہلے اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ملزم کو پیش کیا جب اس نے انکار کر دیا تو وہ گلاس غٹ غٹ خود پی گیا پانی پی کر اس نے اپنی نورانی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ اور سامنے بیٹھے ہوئے لوہار کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

لوہار کا چہرہ بالکل فولاد کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سنولائے ہوئے چہرے کی ساخت پر کسی ہتھوڑے کا گمان ہوتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد آدمی کے چہرے اور اس کے

پیشے میں اتنی مناسبت کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ ہتھکڑی والا ملزم کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ سالہا سال میز پہ کام کرتے ہوئے کلرکوں کی ناک قلم کی چونچ کی طرح کیوں باہر نکل آتی ہے۔ سیٹھ کی توند کیوں اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی کی یاد دلاتی ہے اور گویئے کے چہرے میں اس کی بھنوؤں کی حیلت پھرت میں رخساروں کی لرزش اور گردن کا زیروبم میں کیوں ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے اس کا رگ و ریشہ گوشت کا نہیں۔ ستار کے تاروں کا بنا ہوا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا چہرہ کیسا ہو جائے گا......

لوہار نے سپاہی سے پوچھا ——————

"یہ کون ہے؟"

"چور ہے" سپاہی نے بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

"مگر یہ بیچارہ چلتی گاڑی سے کہاں بھاگ جائے گا۔ ابھی اس کی ہتھکڑی کھول دو۔ اسٹیشن آنے پہ باندھ لینا۔"

"نہیں یہ بڑا خطرناک مجرم ہے۔ اس نے چوری ہی نہیں کی۔ مالکِ مکان کے دو دانت بھی توڑ دیئے تھے۔"

"چوری کرتے ہوئے نا؟" لوہار کی بیوی نے پوچھا۔

"ہاں!" پولیس مین نے اپنی باریک مونچھوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ لوہار کی بیوی بڑی حسین تھی۔

لوہار کی بیوی غصے سے ملزم کی طرف دیکھنے لگی اور پھر خائف ہو کر ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ ملزم نے سپاہی سے کہا ——————

"غلام رسول تمہارے پاس بیڑی ہو گی؟"

غلام رسول نے اسے بیڑی دی۔ بیڑی سلگا کر ملازم نے ایک چلبلی ہوئی نگاہ سے لوہار کی بیوی کی طرف دیکھا۔ اور پھر گردن گھما کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اسے اب کسی کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے اپنی دانست میں لوہار کی بیوی کو سیٹ سے اٹھا کر باہر گاڑی کے باہر ہوا میں معلق کر دیا تھا۔

گاڑی چل رہی تھی۔ لوہار کی بیوی اس کے سامنے ایک اونچی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اور اس کے پیچھے چٹیل میدان۔ لق و دق صحرا اور کہیں کہیں بھوک کے پیاسے درختوں کے روکھے سوکھے سلسلے تیز رفتاری سے پیچھے چلے جا رہے تھے۔

تجھے اس اونچی کرسی پر بٹھا کر میں تجھ سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔ ہاں میں جانتا ہوں تو معصوم نہیں ہے یہاں کوئی معصوم نہیں ہے یہاں کوئی معصوم نہیں ہے۔ اور کوئی مجرم نہیں ہے۔ پھر بھی میں تجھ سے کیوں مخاطب ہوں شاید اس لیے میں ہر شخص کی نگاہوں کا مقابلہ کیا اس کی نفرت کو اپنے چہرے کے آئینے میں ایسا جذب کر لیا کہ مجھے دیکھنے والے کو اس میں اپنی ہی بھیانک صورت کا عکس نظر آئے۔ مگر میں تیرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتا۔ اس لیے نہیں کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اس لیے ملکۂ حسن و جمال میں تجھ سے کہنا چاہتا ہوں یہ حدیث دلبراں نہیں ہے۔ قصہ غم روزگار ہے یہ قصہ شاید تو نے بھی سنا ہو گا ہتھوڑے والا کی کھٹ کھٹ میں تپتے ہوئے لوہے کی آنچ میں رخساروں سے چھلکتے ہوئے پسینے کی ہر بوند میں لیکن سننے اور سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لیکن تو سمجھے گی۔ کیونکہ تو عورت ہے۔ تو ماں ہے

تو جنم دیتی ہے اور نیکی اور بدی کو دودھ پلاتی ہے اگر تو نہیں سمجھے گی تو کون سمجھے گا۔

ملزم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور چند لمحوں کے بعد جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اب اس کی ماں اس کے سامنے کھڑی تھی سفید دھوتی میں ملبوس سر کے بال کھچڑی۔ اور چہرہ؟ جیسے ممتا سے لبریز جام۔ وہ آنکھیں اپنے بیٹے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھیں وہ آنکھیں جیسے درد کی ہری بھری اندر ہی اندر دھنسی جا رہی تھیں کتنے گہرے حلقے بھیانک گرداب۔ آنکھیں جیسے ان خوفناک کھنڈروں میں کھو گئی ہوں پھر جیسے کسی چتا کو آگ لگ گئی۔ اور اب کہیں وہ وہ آنکھیں نہ تھیں نا چہرہ اور نہ رخساروں کی ہڈیوں کے درمیان دو گہرے گڑھے تھے۔

ممتا کا بھی ایک وجود ہوتا ہے ممتا کا بھی رس ہوتا ہے جو زندگی کے چشمے کی طرح پھوٹ کر نکلتا ہے۔ پھر جب تاریکیاں زندگی کو گھیر لیتی ہیں تو یہ چشمہ خشک ہونے لگتا ہے ہولے ہولے کنارے خشک ہونے لگتے ہیں پتلیاں گہری ہونے لگتی ہیں ہڈیاں ابھرنے لگتی ہیں۔ ممتا کا سارا رس آگ میں جل جاتا ہے اور ایک دن صرف ہڈیاں رہ جاتی ہیں۔

"یہ میری ماں تھی" ملزم نے کہا "ایک روز اس نے مجھے جنم دیا تھا۔ ایک روز میں نے اس کی چتا کو آگ لگائی تھی۔ اس روز اور اس کے بیچ میں بڑا کچھ ہوا۔ میں پلا بڑھا۔ جوان ہوا میں نے بی اے پاس کیا۔ کچھ لوگ خاندان کا نام روشن کرتے ہیں میں نے صرف اپنے گھر کا چراغ روشن کرنے کی کوشش کی۔ اور اپنی ماں کی خشک امیدوں میں زندگی کا رس ٹپکانا چاہا۔ کتنی بڑی ہے یہ زندگی۔ یہاں کی زمین ہے اور پہاڑ ہیں۔ سمندر ہیں۔ اور خوبصورتی بادلوں کی طرح انگڑائی لیتی ہوئی سامنے سے گزر جاتی ہے یقیناً اس سمندر کی دو بوندیں میرے لیے بھی ہیں۔ اس خوبصورتی کے ایک ٹکڑے پر کہیں نہ کہیں میرا نام بھی لکھا ہے

نریندر اگر نریندر کا کوئی وجود ہے۔ اگر نریندر کے پاس دو آنکھیں ہیں۔ چکھنے کیلئے زبان ہے۔ محسوس کرنے کے لیے دل ہے۔ سوچنے کے لیے دماغ ہے اگر اس کی کوئی ماں ہے۔ کوئی بہن ہے۔ کوئی گھر ہے۔ کوئی ذمے داری ہے تو اس کو جینے بڑھنے اور اپنی ذمے داریوں کا پورا کرنے کا بھی حق ہے کیونکہ کہیں پر کوئی پھول اس کے لیے بھی کھلا ہے۔ اور کہیں پر کوئی محبت اس کا بھی انتظار کر رہی ہے۔ اور اس پھول کو توڑنے کا۔ اس کی پتی پتی بکھیر دینے کا حق کسی دوسرے انسان کو نہیں ہے۔ کیا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ تم وہ سمجھ رہی ہو؟"

اس کے کانوں میں آواز آئی پولیس کا سپاہی کہہ رہا تھا۔

"اُف کیسی پیاس ہے بجھتی ہی نہیں۔"

نریندر نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں وہ گرد و پیش کی دنیا کو بھول جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی تاریک یادوں کے زینے پر چلتا گیا۔ یکایک زینے میں اسے ایک لڑکی ملی اس نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اب وہ زینہ چڑھتے اس لڑکی کا ہاتھ تھامے ہوئے اوپر شعور کی وادیوں میں آ رہا تھا۔ اور جب وہ ایک، پلیٹ فارم پر آ گیا۔ تو دور ایک کرسی پر وہی لوہار کی بیوی اسے نظر آئی۔ اس نے اپنے ساتھ والی لڑکی کی طرف مڑ کر حزیں انداز میں کہا۔

"ملکہ کو جھک کر آداب کرو۔"

لڑکی مسکرائی۔ اس کے گرد روشنی کا ہالہ تھا۔ اور اس کے بال سورج کی کرنوں میں گندھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس کے رخساروں میں کنول کی تازگی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں تتلیوں کی سی شادابی اور ایک خنک نیلگوں ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا جیسے

آدمی آبشاروں کے نیچے بیٹھ کر آنکھیں بند کر لے۔ کبھی کبھی آنکھوں کی ٹھنکی بہتے ہوئے پانیوں کی یاد دلاتی ہے۔ ذہن میں چشمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ جھرنے اُبلنے لگتے ہیں۔ اور یہ احساس کا پردہ بہاریں فواروں میں نہا جاتا ہے۔

لڑکی جھک کر آداب بجا لائی۔

یہ کنول کی سی تازگی تم نے کہیں دیکھی ہے؟ یہ کشمیری دوشالے کی سی ملائمت۔ یہ ایرانی غالیچے کی سی گداز نرمی۔ یہ بچوں کی سی معصومیت۔ جو کچھ نہ جانتے ہوئے بھی سب کچھ جانتی ہے" نریندر نے لوہار کی بیوی سے پوچھا۔

پھر خود ہی کہا۔

"یہ میری محبوبہ نہیں ہے میری بہن ہے کیا تم جانتی ہو کہ اسے بچانے کا مجھے حق تھا۔ اگر یہ میری بہن نہ بھی ہوتی جب بھی مجھے حق تھا اگر یہ خوبصورت نہ بھی ہوتی جب بھی مجھے یہ حق تھا۔ میرا حق صرف اس بات پر قائم ہے کہ ہر آدمی جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے خوبصورت ہوتا ہے۔ دنیا میں آج تک کسی ماں نے بدصورت اولاد پیدا نہیں کی ہے ایک دن ہٹلر بھی خوبصورت تھا۔ ہلاکو بھی خوبصورت تھا۔ چنگیز بھی خوبصورت تھا۔ اور راون بھی خوبصورت تھا۔ پھر خوبصورتی کیسے بدصورتی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

رام کی معصوم نگاہیں کیسے راون کی بے رحمی میں بدل جاتی ہیں۔ یہی میرا قصہ غم ہے۔

چند لمحوں تک نریندر کا شعور خلاء میں اڑتا رہا۔ اس کے ذہن میں خیالات کی بے ربط لہریں اٹھیں اور خود بخود مٹ گئیں اور پھر ایک دھندلے سے کمرے کی ملگجی سی تصویر ابھری کونے میں ایک گہرے شیڈ کے اندر ایک چھوٹا برقی قمقمہ ٹمٹما

رہا تھا۔ چھت کا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ کمرے کے وسط میں پنکھے کے نیچے سفید براق بستر پہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی خراٹے لے رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھوں کے کونے خراٹوں سے اوپر اٹھ جاتے اور سانس کے وقفوں میں پھر اس کے لبوں کے کونوں پہ آ گرتے تھے۔ اس کے حلق سے بہت سارے سُر ایک ساتھ بج اٹھتے تھے۔ پرانے ہارمونیم کی طرح اس کا چہرہ بھی پرانے ہارمونیم کی طرح اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ گالوں پہ کالے کالے چیتے تھے۔ اور گھٹے ہوئے ماتھے پر رنگین ٹوٹی ہوئی کمانیوں کی ~~طرح ایک~~ دوسرے سے الجھی پڑی تھیں اس کا ایک ہاتھ سینے پہ تھا۔ اور دوسرا سرہانے کی طرف سینے اور ٹانگوں کے بیچ میں پیٹ یوں بھرا ہوا تھا جیسے کسی نے فرش پہ مٹی الٹ کے رکھ دی ہو۔"

"یہ سیٹھ لاکھا رام ہیں"۔ نربندر نے لوہار کی بیوی سے کہا "انہیں اچھی طرح دیکھ لو۔ آج سے ڈیڑھ دو ماہ قبل جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ آدھی رات کے وقت۔ تو یہ اسی طرح سوتے پڑے تھے۔ یہی کمرہ تھا۔ یہی پنکھا تھا۔ یہی لیمپ شیڈ اور دیوار پہ یہی ننگی عورتوں کی تصویریں تھیں۔ ریشمی پردوں پہ یہی موتیوں کی جھالریں تھیں۔ رخساروں پہ ایسی ہی کلا پنج تھی۔ تم پوچھو گی اس آدمی کے کمرے میں آدھی رات کے وقت جانے کا کیا حق تھا۔

تمہارا سوال بالکل صاف اور سیدھا ہے۔ لیکن مشکل یہ کہ میرا جواب اس صاف اور سیدھا نہیں ہے۔

میرا خیال ہے تمہارے سوال کا جواب دینے کے بجائے خود تم۔ بہتر ہو گا کہ کیا تم کبھو اکیلی رہی ہو؟ میری مراد اس رات سے ہے"

خود رکھتا ہے۔ اپنی مرضی سے بھوکا رہنا یا کسی مذہبی وجہ سے یا پیٹ کے نفخ کی وجہ سے اس کو بھوک میں شمار نہیں کرتا۔ گھر میں گیہوں کی بوری پڑی ہو اور آدمی نہ کھائے تم اسے بھوک نہیں کہتے۔ میرا مطلب اس بھوک سے ہے جب کھانے کو گھر میں کچھ نہیں ہوتا اور گھر سے باہر بھی کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ اور نوکری کی تلاش میں بی۔ اے کی ڈگری لے کر گھومتے گھومتے جسم کے سارے اعضا دکھنے لگتے ہیں۔ اور پیٹ کے اندر انتڑیاں عجیب طریقے سے اینٹھنے لگتی ہیں۔ اور اڑوس پڑوس کے گھر سے سالن بھوننے کی خوشبو آ کے آدمی کو قتل پہ آمادہ کر دیتی ہے۔"

کیا کبھی ایسی بھوک سے تمہارا سابقہ پڑا چکا ہے۔ لوہار کی بیوی ہو کبھی تو بھوکا رہنے پہ مجبور کر دی گئی ہو گی۔ مگر ایک ایسی مسلسل لمبی جانگسل بھوک جس میں زندگی کے سارے حواس پیٹ میں مرکوز ہو جاتے ہیں۔ جب آدمی پیٹ سے دیکھتا ہے اور پیٹ سے سنتا ہے پیٹ سے سونگھتا ہے اور پیٹ سے چکھتا ہے ایسی حالت میں آدمی محبت نہیں کر سکتا۔ بلکہ اپنے معشوق کو دیکھ کر یہی سوچتا ہے کہ اس سے پیار کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اسے پکا کے کھا لیا جائے۔ کیا ایسی حیوانی وحشی بھوک تم نے کبھی اپنے جسم کے رگ و ریشے میں محسوس کی ہے؟

تمہاری آنکھوں کی معصومیت تمہارا یہ زندہ و تابناک حسن کہہ رہا ہے کہ اس معاملے میں تم ابھی خوش قسمت رہی ہو۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ تم اس بھوک کے جغرافیے سے واقفیت حاصل کر لو۔ کیونکہ اس خطرناک بھوک کے خوفناک سایے ہمیشہ تمہارے ارد گرد دور اور نزدیک منڈلاتے رہتے ہیں۔

یہ بھوک یکبارگی ہی تم پر نہیں لاد دی جاتی۔ آہستہ آہستہ اس بھوک کا بوجھ تم پر

لادا جاتا ہے۔ وہ لوگ بڑے مزے کے لوگ ہیں یکبارگی نہیں مارتے آہستہ آہستہ مزے لے کر جان سے مارتے ہیں تم نے کبھی بعض فقیروں کو دیکھا ہوگا۔ جن کی انگلیاں ٹوٹی ہوتی ہیں۔ بازو مڑے ہوتے ہیں پاؤں پیچھے کو گھومے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ بالکل بے دست و پا ہو جاتے ہیں تو انہیں لوہے کی سلاخوں پر لٹکا کر بازار میں لایا جاتا ہے اور تماشائی ایک عجوبہ کے طور پر انہیں دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی خیرات میں ایک پیسہ بھی دے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح وہ ہمارے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ پہلے تو وہ ہمیں بی اے تک پڑھاتے ہیں جس سے ہمارے بازو شل ہو جاتے ہیں اور ہم کسی جسمانی محنت کے قابل نہیں رہتے کسی مزدوری کے لائق نہیں رہتے۔ وہ ہمیں ہمارے گھر کی زبان میں نہیں سات سمندر پار کی تعلیم دیتے ہیں۔ شاعری، تاریخ اور فلسفہ پڑھاتے ہیں۔ اور ہمارے ماں باپ کی ساری کمائی اس پڑھائی میں خرچ کرواتے ہیں اور اس کے بعد کاغذ کا ایک پرزہ ہاتھ میں تھما کر کہتے ہیں۔ جاؤ اب تم بی اے ہو گئے۔ اور اس کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غمِ روزگار صرف شاعری اور فلسفے سے حل نہیں ہوتا اور اگر بمبئی کی آب و ہوا مرطوب ہے تو اس سے پیٹ کی بھوک پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور اگر دو حصے پانی میں ایک حصہ آکسیجن ملا دیا جائے تو پانی تو ضرور بن جاتا ہے مگر پانی پینے کے لیے میونسپلٹی کو ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ ہمیں یکایک معلوم ہوتا ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے ہتھوڑا چلانا نہیں جانتے۔ اور کرہ گھر چلانا نہیں جانتے اور کانچ کے بلبلوں میں ہوا پھونکنا نہیں جانتے۔ ہم ٹائپ کرنا نہیں جانتے اور زراعت کرنا نہیں جانتے۔ اور مچھلیاں پکڑنا نہیں جانتے اور انجن چلانا نہیں جانتے گو پیٹ کا انجن برابر چلتا ہے۔ اور پٹرول مانگتا ہے۔ مگر ہم پٹرول بھرنا نہیں جانتے اور گھر میں باپ کڑھتا ہے اور ماں:

غم سے سوکھتی جاتی ہے۔ اور بہن کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں اور ایک ایک کر کے گھر فرنیچر نیلام ہونے لگتا ہے۔ سنگر مشین گئی۔ وہ الماری گئی۔ بید کی کرسیاں گئیں۔ بہن کی شادی کے لیے دو جوڑے تیار کروائے تھے وہ گئے۔ ہاتھ کی انگوٹھی گئی باپ کا قلم گیا۔ گھڑی گئی۔ اب گھڑی کی کیا ضرورت ہے۔ چونکہ بھوک کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ اور یکایک ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو تعلیم ہمیں دی گئی تھی۔ وہ تعلیم نہیں تھی ایک فریب تھا ایک مستقل دھوکا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ہمارے بازو توڑ دیئے جائیں۔

پھر جب تم اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہو تو تمہیں کچھ عجیب سی باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً ایک روز جب میں ایک مل میں کلرک کی نوکری کی تلاش میں گیا۔ مجھے معلوم ہوا یہ مل ہمارے مالک مکان لاکھارام کی ہے اور سیٹھ لاکھارام نے مجھے اس لئے نوکر نہیں رکھا کہ میں نے اس کی کھولی کا چار ماہ کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ بہت غصہ آیا۔ میں بے انصافی کے خلاف اخبار میں آواز اٹھاؤں گا۔ کیونکہ عرضی دینے والوں میں میری کوالی فیکیشن سب سے بڑھیا تھی۔ اس پہ بھی یہ ظلم ہوا کہ جب میں ایڈیٹر کے نام ایک خط لے کر پہنچا اور اس سے ذاتی طور پر اپنی دکھ بھری کہانی بیان کی تو اس بیچارے نے مجھ سے بڑی ہمدردی ظاہر کی۔ اور میرا خط لے کر رکھ لیا۔ اور پھر اسے میرے ہی سامنے پھاڑ دیا۔ میں نے غصے میں آ کر اس سے کہا۔

"یہ آپ نے کیا کیا۔ میرا خط کیوں پھاڑ دیا۔"

"ایڈیٹر بولا ——— اے معصوم نوجوان مجھے تمہیں دیکھ کر رونا بھی آتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔"

میں نے پوچھا ــــ "رونا کس لئے آتا ہے؟"

وہ بولا ــــ "رونا اس لئے آتا ہے کہ تم واقعی سچے ہو اور تم پر واقعی ظلم ہو"

"اور ہنسی کیوں آتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہنسی اس لیے آتی ہے کہ تم جس اخبار میں اپنی مظلومیت کی داستان چھپوانے آئے ہو۔ وہ اخبار بھی سیٹھ لاکھا رام کا ہے۔"

جب میں اخبار کے دفتر سے نکلا تو میرا جسم یکایک کانپنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے میں سڑک پر نہیں چل رہا ہوں کسی وحشی ہاتھ کی ہتھیلی پر چل رہا ہوں۔ تم نے ہاتھ دیکھا ہے نا؟ ہاتھ کی پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ مگر یہ پانچوں کی پانچوں ایک ہاتھ سے جڑی ہوتی ہیں۔

تعلیم۔ سیاست۔ معاشرت۔ صحافت۔ قانون مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب ایک ہی ہاتھ کی سیٹھ لاکھا رام کے ہاتھ کی انگلیاں ہیں۔ کوئی چھوٹی ہے کوئی بڑی۔ مگر ہیں سب اسی کے ہاتھ کی انگلیاں۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں ان انگلیوں کے بیچ میں چل رہا ہوں۔ ان سے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر ان کی گرفت سے باہر کہیں نہیں جا سکتا۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ جب آدمی کسی چیز کو اپنی ہتھیلی سے پکڑنا چاہتا ہے۔ تو اس کی پانچوں انگلیاں کس طرح مدد کرتی ہیں۔ کس طرح وہ اس چیز کو ہر طرف سے ڈھکیل کر ہتھیلی کے بیچ میں لے آتی ہیں اور پھر اسے ہر طرف سے ایک مضبوط شکنجے میں جکڑ لیتی ہیں۔

میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ میں خود سیٹھ لاکھا رام کے کمرے میں نہیں گیا چاروں طرف سے دھکیل کر اس کمرے میں پہنچایا گیا تھا۔ میرا باپ فوت ہو چکا تھا۔ میری ماں نے خود

رنی تھی۔ گھر کا سارا سامان بک چکا تھا۔ مسلسل بھوک اور پریشانی کا سامنا تھا۔ بہن
نگاہیں مجھے ہر وقت خاموشی سے دیکھتی تھیں۔ اب میرے پاس اور کوئی ذریعہ
یں رہا۔ سوائے اس کے کہ میں چوری کر دں۔ اس لیے آدھی رات کے وقت میں
سیٹھ لاکھا رام کے کمرے میں موجود تھا۔

میں مانتا ہوں میں نے چوری کی۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ میں نے سیٹھ کے دو
نت مکا مار کر توڑ دیئے۔ مگر میں مجبور تھا۔ سیٹھ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ پستول
نا چاہتا تھا۔ میرے سامنے سوال بالکل سیدھا تھا ایک طرف میری زندگی تھی۔
طرف سیٹھ کے دو دانت تھے۔ میں نے سیٹھ کے دو دانت توڑ دیئے اور وہ
اکہ گر پڑا۔ اور میں تھیلی لے کر باہر نکل گیا۔

میں اپنے آپ کو معاف کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں سیٹھ کو بھی معاف کرنا نہیں
ہتا۔ کیونکہ پستول کے اٹھانے اور دانتوں کے توڑنے کے درمیان بھی ایک مختصر
کہانی ہے۔ جب میں نے سیٹھ سے اپنی تکلیف بیان کی اور اس سے کہا کہ میں صرف
ار روپیہ چاہتا ہوں کہ جس سے میں اپنی اور اپنی بہن کی بھوک مٹا سکوں صرف ایک مہینے
لیے اس کے بعد میں پھر فاقوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ تو سیٹھ
کہا۔ تمہیں تو سب کچھ مل سکتا ہے۔ نوکری، مکان، اچھا کپڑا ایک چھوٹی سی کار۔
پنس..... اور اس کے عوض وہ صرف میری بہن چاہتا تھا۔

میں نے اچھا کیا نا اس کی ہوس کے دانت توڑ دیئے۔ گو اس کے لیے مجھے تین
کی سزا ہو گی۔ مگر تم عورت ہو تم میری ساری باتیں نہیں سمجھ سکو گی۔ مگر شاید اس بات
جانتی ہو گی۔ یہ صحیح ہے کہ ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا ہے لیکن میں نے بھی انہیں پکڑ لیا

ہے۔ میں بھی سمجھ گیا ہوں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو بات سیٹھ کہتا ہے وہی سیاستدا
کہتا ہے وہی میرے کالج کا پرنسپل کہتا ہے۔ وہی قانون دان کہتا ہے و
کی طوائف کہتی ہے۔

نوکری۔ مکان۔ اچھا کپڑا۔ ایک چھوٹی سی کار۔ بینک بیلنس۔ یہ سب کچھ۔
مگر نیکی۔ عزت۔ شرافت۔ محبت یہ سب کچھ نہیں۔

اور آخر میں میری بہن بھی نہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آج اس وقت میری بہن کہاں ہے؟ یہ گاڑی جو تمہیں تمہار
گھر لے جا رہی ہے۔ مجھے میری جیل لے جا رہی ہے۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ آج میر
بہن کہاں ہے۔ کس نے اس کی کنول کی سی تازگی کو اپنی ہتھیلی میں لے لیا۔ کس نے ا
کی مہربان ملائمت کو ایک کشمیری دوشالے کی طرح اوڑھ لیا۔ کس نے اس کی معصوم نر
کو ایک ایرانی غالیچے کی طرح اپنے قدموں میں بچھا لیا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔

نریندر نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اب اسے فیصلے کا انتظار نہ تھا۔ اب اس کے دل
اندر مکمل خاموشی تھی۔ اور خلا میں وہ لٹکتی ہوئی کرسی بھی غائب ہو گئی تھی۔ یکایک وہ کو
سے پلٹ کر مسافروں کی طرف گھوم گیا۔ لوہار کی بیوی اس کے سامنے لکڑی کی
پر بیٹھی تھی۔ اور اپنے خاوند کی طرف مسحور کرنے والی نگاہوں سے دیکھ رہی
یکایک نریندر کو بہت پیاس لگی۔

دُوسرا باب

گاڑی دھیمی ہوتے ہوئے ایک دھچکے کے ساتھ شیام پور کے پلیٹ فارم پر رک گئی۔ نریندر اپنی سیٹ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے غلام رسول سے کہا۔

"باہر چلو ذرا ٹانگیں سیدھی کر لیں"

غلام رسول اسے تھرڈ کلاس کے ڈبے سے باہر نکال کر پلیٹ فارم پر لے آیا اور اس کے ساتھ پلیٹ فارم پر چلنے لگا بہت سے لوگ متجسس ہو کر نریندر اور غلام رسول کی طرف دیکھ رہے تھے۔ قیدی لانبا اور گٹھیلے جسم کا تھا اور تین چار دن کی داڑھی کے باوجود اس کے چہرے پر ایک پروقار ملکوتیت تھی، اس کی شربار نگاہوں کی تیزی سب کو خائف کئے دیتی تھی۔ وہ لوگ چند لمحوں کے لیے اسے دیکھتے پھر آنکھیں چرا کر اپنے ڈبے کی طرف چلے جاتے۔

"بیڑی ہیو گے ؟" غلام رسول نے پوچھا۔

"ہاں !"

نریندر نے بیڑی سلگائی اور پلیٹ فارم پہ آہستہ آہستہ ٹہلتا رہا۔

لوہار نے دو سنگترے خریدے

غلام رسول نے اپنی بیوی کے لیے ایک چھوٹی سی مور کی پنکھی خریدنی اور اپنی چھوٹی لڑکی کے لیے گلابی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس گڑیا۔

کار نا کر لوہے کا ڈنڈا اور پیچ کس لیے گاڑی کے پہیے دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ ہتھکڑی پہنے ہوئے نوجوان کو دیکھ کر رک گیا۔ اور غلام رسول سے پوچھنے لگا

"کون ہے ؟"

"چور !"

نریندر نے مسکرا کر بیڑی کا دھواں کار نا کر کے منہ پہ چھوڑ دیا۔ کار نا کر آگے چلا گیا۔ ایرکنڈیشنڈ ڈبے کی کھڑکی سے ایک دوہری ٹھوڑی والے کھدر پوش سیٹھ نے چلا کر اپنے نوکر سے کہا۔

"جلدی سے گرم پانی بھر کے لا سوڑ کے بچے۔"

نوکر بھاگتا ہوا چائے والے کی دکان پہ چلا گیا۔

نریندر نے سوچا۔ سفید براق کھدر میں لپٹی ہوئی گالی کتنی مقدس معلوم ہوتی ہے۔

دو رشندھی تاجر شارک سکن کے سوٹ پہنے ہوئے اپنے سیکنڈ کلاس ڈبے کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے نریندر کی طرف گھور کے دیکھا ایک نے دوسرے

سے کہا۔

"بڑا خطرناک مجرم معلوم ہوتا ہے۔ حرامزادہ"

نریندر مسکرا دیا۔ مگر مسکرانے کے بعد بھی وہ اس گالی کو حلق سے نیچے نہ اتار سکا۔ یکایک اسے چائے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

غلام رسول نے کہا "مگر گاڑی چھوٹنے والی ہے۔"

"کوئی ہرج نہیں" نریندر نے کہا "میں بس ایک منٹ میں چائے پی لوں گا۔ اور لپک کر گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔"

چائے کی دکان پر پھر اسے کنکھیوں سے تاکا گیا۔ غلام رسول کو پھر تشریح کرنا پڑی۔ لوگ تھوڑے تھوڑے پیچھے ہٹ گئے۔ جیسے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے جسم کا کوئی کونہ چور کے جسم سے چھو جائے۔

نریندر ابھی چائے پی رہا تھا کہ گاڑی نے سیٹی دی۔

"جلدی کرو۔ جلدی کرو" غلام رسول نے گھبرا کر کہا۔

نریندر اطمینان سے چائے پیتا رہا۔

گاڑی چلنے لگی۔

غلام رسول نے ہتھکڑی کھینچ کر کہا "جلدی کرو گاڑی جا رہی ہے۔"

غلام رسول نے اس زور سے اس کی ہتھکڑی کھینچی کہ نریندر کے بندھے ہوئے ہاتھوں سے چائے کی پیالی فرش پر گر پڑی۔ اور چکنا چور ہو گئی۔ چائے والا چلایا۔

"میرے پیسے ....."

غلام رسول نریندر کو کھینچتے ہوئے گاڑی کی طرف بھاگا۔ نریندر بھی زور سے

دوڑنے لگا۔ دونوں دوڑتے دوڑتے ایک ایرکنڈیشنڈ ڈبے میں داخل ہو گئے

"گاڑی چلی جاتی تو" غلام رسول نے اسے تہدید کرتے ہوئے کہا۔

"تو دوسری گاڑی سے آجاتے کون سی برات میں جا رہے تھے۔ نریندر نے جواب دیا۔

غلام رسول کا سانس ٹھہرا تو اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے سامنے دو مرد اور دو عورتیں تاش کھیل رہے تھے۔ میز پہ چار گلاسوں میں بیئر چھلک رہی تھی۔ عورتوں نے دونوں ہاتھوں میں تاش کے پتے پکڑ رکھے تھے۔ مردوں نے ایک ہاتھ سے تاش اور دوسرے سے عورت کی کمر کو پکڑ رکھا تھا۔

غلام رسول نے مسکرا کر کہا: "معاف کیجئے گا گاڑی چھوٹ گئی تھی اس لئے بھاگ کر اس ڈبے میں آگئے۔ اپنے ڈبے میں نہ جا سکے۔ آپ کو اگلے اسٹیشن تک زحمت تو ہو گی۔ مگر کیا کروں سرکاری معاملہ ہے مجبور ہوں۔

ایک مرد نے کہا۔ "اب اگر آئے ہو تو یہ کیا ضروری ہے کہ ہمارے سر پہ چڑھ کر بیٹھو۔ ادھر ادھر ٹہلتے رہو۔"

ایک عورت جس کے رخساروں کا رنگ بیئر کے رنگ کی طرح سنہری تھا غلام رسول سے پوچھنے لگی۔ "اس نے کیا جرم کیا ہے؟" وہ عورت تعرفی نگاہوں سے نریندر کی طرف دیکھنے لگی۔ دوسری عورت اس سے انگریزی میں بولی۔ "چور ہے مگر بڑا حسین اور خوب رو ہے نا شکنتلا!"

شکنتلا نے کہا۔ "ڈارلنگ ذرا سنبھل کے بیٹھو نا کہیں تمہارا دل نہ چرا لے پھر تمہارے شوہر کو کیا کہوں گی۔ کیوں مسٹر چھگن لال؟"

چھگن لال نے شکنتلا کو اپنی نگاہوں سے ایک لقمہ کی طرح چباتے ہوئے کہا۔ کشل ڈارلنگ اما کے شوہر کے متعلق کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے وہ بالکل طوطیا ہے طوطیا" اما ہنسنے لگی۔

چھگن نے پتے پھینک کر کہا۔" یہاں ہر بازی ہرتی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کھنہ ہم لوگ سیٹیں بدل لیں۔"

کھنہ نے کہا یوں کیوں نہیں کہتے کہ شکنتلا کے بازو میں بیٹھنا چاہتے ہو۔ یاد رکھو امانت میں خیانت ہو جائے گی۔ شکنتلا تمہارے جگری دوست کی امانت ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ چھگن اپنی ہیرے کی انگوٹھی کو انگلی میں گھماتے ہوئے بولا۔" یوں تو اپنا دھندہ ہی یہی ہے اس کی پگڑی اس کے سر"

شکنتلا نے چمک کر کہا۔" اور اس کی عورت اس کی بغل میں۔"

" ڈارلنگ تم بہت سمجھدار ہوتی جاتی ہو تمہیں تو سٹاک ایکسچینج پر کام کرنا چاہئے" کھنہ اس کی کمر میں چٹکی لے کر بولا۔ وہ چاروں پلیسنے لگے۔

نریندر نے سرگوشی میں کہا۔ آؤ اب آگے چلیں۔ ہاں اگر تم انہیں شراب نوشی کے جرم میں پکڑوانا چاہتے ہو تو اور بات ہے۔

غلام رسول نے سرگوشی ہی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔" میرا سر پھرا ہے کیا۔ میں نے ایک مرتبہ ایک سیٹھ کو پکڑا تھا۔ مسالہ نے الٹا مجھ ہی تقریباً برخاست کرا دیا تھا۔ نہ بھائی میں باز آیا۔ بیوی بچوں والا آدمی ہوں چھ مہینے پنشن میں رہ گئے کسی نہ کسی طرح گزر جائیں گے۔

غلام رسول اور نریندر آگے کھسک گئے یہ ایکنڈیشنڈ کمرہ ایک بارک کی طرح

تعمیر کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ لگے ہوئے ایک دوسرے سے ملحق چار کمرے تھے سامنے ایک پھیلتے ہوئے برآمدے کی طرح جگہ خالی تھی۔ جس میں سفید کھڑکیوں کے چوکھٹوں میں نیلگوں شیشے لگے تھے۔ کمروں کے اندر دھیمے دھیمے پنکھوں کی صدا غنودگی کا سا اثر پیدا کرتی تھی۔

اگلے کمرے میں ایک سیٹ پر ایک سیٹھانی سو رہی تھی۔ پیٹی کوٹ سے اس کی آدھی ٹانگ، بالوں بھری ٹانگ، باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ سونے کے کنگنوں سے جھنجھناتا ہوا فرش پر لٹک رہا تھا۔ دوسری سیٹ پر وہ کھدر پوش سیٹھ جس نے اپنے نوکر کو گالی دی تھی۔ آیا سے اپنا ایک سوجا ہوا پیر دھلوا رہا تھا۔ اور آیا کے سر پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا۔ دونوں سیٹوں کے بیچ میں ایک پالنے میں ایک بچہ سویا ہوا تھا۔
سیٹھ نے آیا کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ بڑے چکنے انداز میں کہا۔
بریا تم کتنی
مگر وہ یکایک کہتے کہتے رک گیا۔ دوسرے لمحے میں غلام رسول اور نرمبدا اس کے کمرے کے سامنے سے گذر گئے۔

اگلے کمرے میں ایک یوروپین گنجے مرد سے اس کی عورت غصے سے کہہ رہی تھی "مجھے تم سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔ اب ہماری تمہاری صلح نہیں ہو سکتی دیکھو اگر تم نے مجھے طلاق نہ دی تو میں تم سے کہتی ہوں۔ میں بلن تم سے ایسا انتقام لوں گی۔ ایسا۔۔۔"

وہ بھی کہتے کہتے رک گئی غلام رسول اور نرمبدا جلدی سے آگے کھسک گئے اگلے کمرے پہ پردہ پڑا ہوا تھا اس لیے وہ کچھ نہ دیکھ سکے ہاں پردے کے پیچھے

نقرئی قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ بیچ میں یہ آواز رک گئی جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ یا منہ پر منہ رکھ دیا ہو۔ پھر جیسے بوتل سے کارک کے نکلنے کی سی آواز پیدا ہوئی۔ اور کوئی کہنے لگا۔

"ہٹو بہت کس کر لیا۔"

"ایک اور —"

"نہیں یہ گیلا پیار ہمیں اچھا نہیں لگتا۔"

"پھر کیا اچھا لگتا ہے؟"

"ایسے!"

ایک وقفے کے بعد پھر بوتل سے کارک کے نکلنے کی دھیمی سی صدا آئی۔ ایک مردانی آواز نے پروٹسٹ کرتے ہوئے کہا۔

"واہ یہ بھی کوئی پیار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہونٹ پہ ہونٹ نہیں رکھ رہے ہیں بلکہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھکر تالی بجا رہے ہیں۔"

جواب میں پھر نقرئی قہقہہ گونجا۔

نریندر اور غلام رسول آگے نکل گئے۔ مگر آگے دو قدم آگے چوبی دیوار تھی اس لئے لامحالہ بیچاروں کو واپس آنا پڑا۔ جب واپس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اب چاروں کمروں پہ پردے پڑے ہوئے ہیں۔

ان کے قدموں کی چاپ پر وہ کھدر پوش سیٹھ اپنے کمرے سے باہر نکل کر گویا زور زور سے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے جس میں نیلم اور یاقوت کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ اس نے غلام رسول کو دیکھتے ہی کہا کیا تمہارے پاس ایر کنڈیشنڈ

کا ٹکٹ ہے ؟"

"نہیں" غلام رسول نے عاجزی سے کہا۔

"پھر تم چور اچکے، ڈاکوؤں کو لے کے اس کمرے میں کیوں آئے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں یہ کونسی جگہ ہے" کھدر پوش نے چلا کے کہا

"ہاں ہم جانتے ہیں" نریندر نے مسکرا کے کہا "یہ ایر کنڈیشنڈ چیمبر ہے"

کھدر پوش سیٹھ کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ مگر وہ اس کے بعد کچھ نہیں بولا "پولیس میں رپورٹ کرنے" کی دھمکی دیتا ہوا اندر گھس گیا۔ اور زور سے پردے کو کمرے پر سرکانے لگا۔

نریندر نے چاروں لٹکے ہوئے پردوں کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھا پھر وہ بڑے مزے سے مسکرایا۔ پھر اس نے اپنی داڑھی کھجائی۔ پھر آہستہ سے پلٹ کر اس نے غلام رسول سے کہا۔

"اس برقعہ پوش ڈیے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ ایمان سے سچ سچ کہنا"

غلام رسول نے کانوں پر ہاتھ دھر کے "بابا میں تو تم سے عاجز آ گیا خدا کی قسم تمہیں جب تک جیل والوں کے حوالے نہیں کروں گا میری جان میں جان نہیں آئے گی"

وہ دونوں گاڑی کے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور باہر دیکھنے لگے۔

دونوں مخالف سمتوں کو دیکھ رہے تھے۔

غلام رسول آگے ہوا میں اپنے گھر کا دروازہ دیکھ رہا تھا وہ کنڈی بجا رہا تھا دروازہ کھل رہا تھا۔ اس کی بیوی مسکراتے ہوئے استقبال کر رہی تھی وہ اسے مور پنکھی دے رہا تھا بچے اسکی ٹانگوں سے لپٹ رہے تھے کچن سے بھنے ہوئے گوشت

کی خوشبو آ رہی تھی۔ ڈیڑھ ماہ کے بعد وہ گھر جا رہا تھا۔ غلام رسول کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گاڑی آگے جا رہی تھی۔ نرینڈر پیچھے کی سمت سوچ رہا تھا اسکا باپ جو مر چکا تھا۔ اس کی ماں جو مر چکی تھی۔ اس کی بہن۔ ایک طرح وہ بھی اس کے لئے مر چکی تھی۔ اس کا اپنا مستقبل جیل میں تھا۔ اور اس کے سامنے لق و دق چٹیل میدانوں اور ریگستانوں میں خاک اڑ رہی تھی۔ زمین سے آسمان تک آج سورج کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔

صحرائی دھند کا ملگجا غبار فرش سے عرش تک چھا رہا تھا اس بے کراں دھند میں روشنی کا چشمہ کہاں سے ملے گا۔ چاروں طرف سناٹا۔ جیسے دل کی وادیاں سو گئی ہوں۔ اور آوازوں کے ریگستان میں کہیں کوئی گیت نہ بہتا ہو۔ دھند۔ غبار۔ ریت اور پہاڑوں کے سنگلاخ سینے میں سکڑتے ہوئے مرتے ہوئے گویا ہتھکڑیوں سے جگڑے ہوئے درختوں کی ہر شاخ بے ثمر۔ ہر ڈال بے برگ کہاں ہو میری امیدوں کے ہرے پتو!۔

میری امنگوں کی لہکتی ہوئی شاخو!!

میری آرزؤں کی نو دمیدہ کلیو!!

سناٹا۔ چاروں طرف سناٹا۔ . . . . . .

یکایک نرینڈر نے گھبرا کر اپنا سر گاڑی کے دروازہ پر زور سے پٹخ دیا۔ ایک بار۔ دوسری بار۔ یکایک غلام رسول نے اسے جلدی سے پکڑ لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو نرینڈر۔ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو"

پھر جیسے غلام رسول نے اس کے دل کی نا امیدی کو سمجھ کر اسے اپنے گلے

سے لگا لیا۔ اور اس سے کہا — "صبر کرو نریندر۔ میرے بیٹے صبر کرو —
خدا سب کی سنتا ہے۔ وہ تمہاری بھی سنے گا۔"

نریندر کے چہرے پر ایک غمگین مسکراہٹ آگئی۔ وہ اپنے ماتھے کا لہو پونچھے
بغیر خلاؤں میں دیکھ رہا تھا۔

تیسرا باب

گاڑی دیدار گڑھ کے اسٹیشن پر آ کر رک گئی۔

ایر کنڈیشنڈ کمروں کے پردے سرک گئے۔

نریندر اور غلام رسول گاڑی سے نیچے اترے اور اپنے تھرڈ کلاس کے ڈبے کی طرف چلنے لگے۔ مگر تھوڑی دیر چلنے کے بعد روک دیئے گئے۔ جہاں وہ روک دیئے گئے وہ گاڑی سے بہت ملحق بہت بڑا شاندار سیلون کھڑا تھا۔ جو پیچھے سے لگ کر آیا تھا۔ اس سیلون کے دروازے سے لے کر اسٹیشن کے دروازے تک فرش پر سرخ رنگ کا حلوان بچھا تھا۔ اور دو رویہ سپاہی برہنہ شمشیر اٹھائے۔ آہنی شکل کھڑے تھے۔ اور ان سپاہیوں کے پیچھے دونوں طرف ڈبوں سے لوگ بھاگ بھاگ کر آ رہے تھے۔ اور آ کر کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ چہ میگوئیاں

ہو رہی تھیں۔

"کیا ہے؟"

"کون ہے؟"

"کس کا سیلون ہے؟"

پھر مجمع میں سے کسی نے کہا —

"دیدار گڑھ اسٹیٹ کا سیلون ہے"

"دیدار گڑھ کا راجہ آ رہا ہے۔"

"نہیں ان کی رانی سفر کر رہی ہے"

"نہیں جی اس سیلون میں دیدار گڑھ کا وزیر سفر کرنے والا ہے۔"

"بے چارہ عرصے سے بیمار ہے یہ سیلون اسے بمبئی لے جائے گا۔"

"اس سے پہلے تو یہ گاڑی یہاں رکتی نہ تھی۔"

"تو کیا تمہارے میرے لئے رکتی۔ ارے راجہ آ رہا ہے راجہ۔"

"راجہ نہیں رانی۔"

"پتاجی! پتاجی! میں بھی رانی کو دیکھوں گا"۔ ایک ننگ دھڑنگ پنڈت کا لڑکا ٹھنکتے ہوئے اپنے باپ سے کہنے لگا۔

باپ نے اسے اپنے کندھوں پر چڑھا لیا۔

کئی منٹ تک لوگ اس طرح ایک دوسرے سے باتیں کرتے ایک دوسرے کو دھکا دیتے۔ ریلتے پیلتے سپاہیوں کے پیچھے کھڑے اپنی گردنیں اٹھا اٹھا کر سیلون سے اسٹیشن کے دروازے تک اور اسٹیشن کے دروازے تک دیکھتے رہے۔

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو اپنی چال ڈھال اور شکل و صورت سے بڑا جھگڑالو معلوم ہوتا تھا۔ غصّے میں آکر بولا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے۔ ایک آدمی کے لیے گاڑی اتنی دیر روک دی جائے یہ خلافِ قانون ہے۔ میں رپورٹ کروں گا۔"

ایک بڈھے خوجے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "یہ علاقہ یہ زمین جس پر تم کھڑے ہو۔ ریاست دیدار گڑھ کے عملداری میں ہے۔ وکیل صاحب زیادہ بولے، حرّی کی تو دھر لیے جاؤ گے۔"

ادھیڑ عمر کا وکیل نتھنے پھلا کر غرّایا۔ "میں بیٹے بار ایسوسی ایشن کا صدر ہوں مجھے پکڑنے کیلئے ہمت چاہیئے حاجی عیلی صاحب!"

حاجی عیلی نے پھر اس کے کندھے کو بڑے مشفقانہ انداز میں تھپتھپایا اور اپنی ننھی بکلاسی داڑھی کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "آرام سے کھڑے کھڑے تماشہ دیکھتے جاؤ۔"

یکایک مجمع میں ایک شور بلند ہوا۔ اور سب کی نگاہیں اسٹیشن کے دروازے پر لگ گئیں۔ گارڈ کے افسر نے چلا کر کہا۔

"اٹین شن!"

سپاہیوں کی گردنیں تن گئیں۔

گارڈ کا افسر پھر چلایا۔

سپاہیوں نے اپنے ہاتھوں کو آگے اونچا بڑھا کر آرپار برہنہ شمشیروں کی ایک محراب بنا لی۔ اسٹیشن کے دروازے سے آگے گارڈ آفیسر چلا اور اس کے پیچھے

پیچھے دستاپٹی کا نک خوبصورت جودھ پوری پگڑی۔ بند گلے کا سفید کوٹ اور پتلون پہنے اپنے لباس پر مطلا گوٹ لگائے چل رہے تھے۔

مجمع میں پھر شور بلند ہوا۔

"راجکماری۔ راجکماری۔ دیدار گڑھ کی راجکماری۔"

غلام رسول کو کہنی مار کے نریندر ذرا آگے بڑھ گیا۔ اور شمشیروں کی محراب تلے گزرتی ہوئی اس سیمیں پیکر کو دیکھنے لگا۔

سفید براق ساڑھی میں ملبوس ایک لڑکی چاند کی کرن کی طرح لرزتی ہوئی ا کے سامنے سے گزر گئی۔ اس کا سنگ مرمر کی طرح بے داغ چہرہ پتلے سرخ ہونٹ اور نشیلی انکھڑیاں اس کے احساسات کی وادیوں میں ایک کوندے کی طرح لہرا کے گزر گئیں اس کے بعد پھر اندھیرا تھا۔

تو یہ راجہ تھا۔ یہ رانی تھی۔ یہ لونڈیاں تھیں یا یہ مصاحب تھے۔ یہ گلدان تھے سوٹ کیس تھے۔ مگر نریندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سب کچھ نہیں تھے جو تھی و ایک مسکراہٹ تھی۔ جو ہونٹوں سے گزر چکی تھی۔ ایک خوشبو تھی جو فضا میں بکھر چکی تھ ایک بجلی تھی جو لہرا کے گر چکی تھی۔ اور اب سیلون کو بہت سے لوگوں نے گھیر لیا تھا ریاست کے افسر نے۔ مصاحبوں نے۔ خوشامدیوں نے ان کی کمر بار بار آداب کے سے جھکی جا رہی تھی۔ اور وہ بار بار پاس ادب سے اس طرح دہرے ہوتے جاتے کہ بڑے آسانی سے اپنا چہرہ اپنے چمکتے ہوئے جوتوں میں دیکھ سکتے تھے۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد اس سیلون سے راجہ رانی صاحبہ اور ایک کانک والے لوگ باہر نکلے اسٹیشن ماسٹر نے جھک کر راجہ صاحب کو سلام کیا۔ اور پھر چھپا ۔ بچ

اب گاڑی چھوڑی جائے گی ؟"

راجہ صاحب نے اسٹیشن ماسٹر کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ اسٹیشن ماسٹر نے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر نے ٹرین کے گارڈ کی طرف دیکھ کے سر ہلایا۔

پھر ہلے جھنڈیاں ہلیں۔ آہستہ آہستہ گاڑی اپنی جگہ سے ہلی۔

اب کی بار نریندر راجکماری کا صرف ہاتھ ہی دیکھ سکا۔ جو راجہ صاحب اور رانی صاحبہ کو الوداع کہہ رہا تھا۔ چونکہ گاڑی چل پڑی تھی۔ اس لیے غلام رسول اسے جلدی سے گھسیٹ کر ساتھ والے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں لے گیا۔ ہانپتے ہوئے کہنے لگا کیا مصیبت ہے اپنے ڈبے میں جانا ہی نہیں ہوتا۔"

نریندر نے کوئی جواب نہیں دیا اس کے ذہن میں وہی ہاتھ چمک رہا تھا۔ وہ ہاتھ جس کی ہر نازک حرکت میں ایک رقص کا سا بہاؤ تھا۔ وہ انگلیاں تھیں کہ گلاب کی کلیاں تھیں جن کی مہکتی پوروں سے ایک خاموش راگ پھوٹ رہا تھا۔ گوری کلائی کے خم سے الجھا ہوا وہ مرصع کنگن کسی محبت کی نازک ہتھکڑی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ نریندر اپنی فولادی ہتھکڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ الو کا پٹھا آپ چوری اور ضرب شدید کے جرم کے الزاموں کے طفیل شاید تین سال کے لیے جیل کی ہوا کھانے جا رہے ہیں مگر پھر بھی ایک راجکماری کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ نریندر اپنی حماقت پر مسکرایا۔ گدھے! مخروطی انگلیوں کے بارے میں کیا سوچتا ہے انگلیوں میں پڑنے والے چھالوں کے بارے میں سوچ۔ پتلے پتلے سرخ ہونٹوں کے بارے میں کیا سوچتا ہے جیل کی چکی کے دبے موٹے پتھریلے ہونٹوں کے بارے میں سوچ۔ سرخ سفید نیلگوں رنگوں میں نہائے ہوئے

سیلون کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ سوچ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی کے بارے میں جس کے روشندانوں سے بھی روشنی کے بجائے اندھیرا بہہ کے آتا ہے۔ جس کی مٹی ہوئی ہوئی سے صدیوں کی سڑاند کی متعفن بو آتی ہے۔ سوچ اور رینگتے ہوئے کلبلاتے ہوئے وقت کے آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے کیڑوں کے بارے میں جو تیری جوان زندگی کے تین سال کھا جائیں گے۔

مگر میں کروں کیا! نریندر نے سوچا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے مگر میرے دل پہ تو کوئی ہتھکڑی نہیں ہے۔ میرے جسم پہ زنجیر ہے لیکن میری سوچ پہ تو کوئی زنجیر نہیں ہے۔ میں جوان ہوں۔ میں خوبصورتی کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔

"تمہارا قیدی آپ ہی آپ مسکرا رہا ہے۔" ایک مسافر نے غلام رسول سے کہا۔

غلام رسول نے ہنس کر کہا۔ "جی اس نے راجکماری دیکھی ہے۔"

اس مسافر نے مسکرا کر کہا۔ ہاں تو میں نے بھی دیکھی ہے۔ واقعی بڑی خوبصورت ہے۔"

"اجی خوبصورت ہے تو کیا ہوا گاڑی بیس منٹ لیٹ کر دی۔ یہ بھی کوئی تک ہے۔" "اسی طرح اگر رستے میں ہر دو بیدا گڑھ کی راجکماری کے لیے گاڑی لیٹ ہونے لگی تو ہم لوگ تو شاید ایک مہینے میں بمبئی پہنچیں گے ڈاکٹر صاحب!"

نریندر نے اس بحث میں کوئی حصہ نہ لینا ہی مناسب سمجھا۔ اسے سامنے ادھیڑ عمر کے جھگڑالو آدمی سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی جو اپنے آپ کو بادا الیکشن کا امیدوار کہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مسافر بیٹھا تھا جس نے راجکماری کے حسن کی تعریف کی تھی۔ ... صاحب کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ ڈاکٹر

گول گورے بھنوی چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت اور ملائمت تھی اس کا چہرہ مرد کا نہیں ایک ایسی عورت کا سا تھا جو بیٹ سے ہو۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھے بڑے مزے سے آلتی پالتی مار کے بیٹھا تھا۔ نریندر کے ماتھے پر خون دیکھ کر ڈاکٹر نے چونک کر سپاہی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا ہو نہ ہو اس قیدی کو سپاہی نے پیٹا ہے۔ مگر پھر نریندر نے کیوں غلام رسول کے چہرے کی طرف دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا کہ ایسا آدمی تو دکھائی نہیں دیتا۔ مگر پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔

"یہ اس کے ماتھے پر چوٹ کیسے لگی ہے"

"دروازے سے ٹکرا گیا تھا۔"

"دوا نہیں لگائی تو زخم پھیل جائے گا۔"

ڈاکٹر کامتھ اپنی سیٹ سے اٹھا اور بکس کھول کر دوا نکالنے لگا۔ جب وہ نریندر کے دوا لگا رہا تھا۔ تو نریندر نے آہستہ سے اس سے کہا "ڈاکٹر صاحب! زخم تو بہتیرے ہیں۔ آپ کہاں کہاں زہر کو پھیلنے سے روکئے گا۔

ڈاکٹر کامتھ بمبئی کے تائیں بابا کا مرید تھا۔ وہ نریندر کی چوٹ سمجھ گیا تھا۔ یہ چوٹ جو اس کے ماتھے پر نہیں اس کے دماغ کے اندر تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تائیں بابا سب ٹھیک کر دیں گے۔"

"تائیں بابا کیا جراح ہیں۔ جو ہر زخم کو ٹھیک کر دیں گے ڈاکٹر صاحب"! ایک ڈھیلا کرتہ پہنے زری مہری کا پاجامہ پہنے ہوئے ایک نوجوان ڈاکٹر کامتھ کی طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کامتھ کے بالکل اوپر کی برتھ پر ٹانگیں لٹکائے برتھ پر جھکا ہوا بات کر رہا تھا۔ آپ کو تائیں بابا پر بڑا اعتقاد ہے لیکن ہزاروں بچے پھر بھی ہر روز مختلف

بیماریوں سے مر جاتے ہیں۔ سڑکوں پر بھکاری بھیک مانگتے ہیں۔ حاجی عیسےٰ ایسے سیٹھ بلڈنگیں کھڑی کرتے ہیں۔ اور کامنھ جیسے شریف ڈاکٹر کو اپنا جما جمایا روزگار چھوڑ کر ناگ پور سے بمبئی جانا پڑتا ہے۔

حاجی عیسےٰ چونکے۔ مگر راستے میں وہ اس نوجوان سے کافی بک بک جھک جھک کر چکے تھے۔ اس لیے اس وقت انہوں نے خاموش رہنے ہی میں مصلحت سمجھی۔ ہاں ڈاکٹر کامنھ ضرور بڑبڑایا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "داتا ئیں بابا سب کچھ ٹھیک کر دیں گے اس میں بھی ضرور کوئی مصلحت ہو گی۔

ڈاکٹر کامتھ واقعی بڑا شریف ڈاکٹر تھا۔ یعنی وہ ایسا ڈاکٹر تھا جو بازاروں میں پریکٹس کرنے کے قابل نہیں تھا۔ بازاروں کا بھاؤ۔ تاؤ۔ جوڑ۔ توڑ۔ ادھا سے کم دینا اور دوسرے سے زیادہ نفع لینا۔ اشتہار سے شہرت حاصل کرنا اور پھر لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا۔ گاہک کی جیبوں میں صفائی سے ہاتھ ڈال دینا۔ یا اس کی جیب کتر لینا۔ اس کے سامنے اس طرح کہ وہ قینچی چلتے ہوئے دیکھے اور پھر یہ بھی محسوس نہ کرے کہ اس کی کتری جا رہی ہے یعنی بازاروں میں بیٹھ کر ترقی کرنے کے جتنے گر تھے وہ انہیں بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ ان گروں سے ناواقف تھا۔ مگر وہ کہتا تھا۔ دیکھو بمبئی میں ڈاکٹر ہوں جیب کترا نہیں ہوں۔ مگر یہی اس کی سب سے بڑی حماقت تھی۔ بازاروں میں بیٹھ کر آدمی شرافت بگھارنے نہیں آتا۔ اپنی ذہانت اپنی لیاقت۔ ڈاکٹری۔ آم۔ ہلدی۔ نمک کپڑا۔ رنگ۔

ل صفا پوڈر۔ بال بڑھانے کا تیل۔ حمل قائم کرنے کی دوا۔ حمل گرانے کی دوا۔ سب کچھ بیچنے
آتا ہے۔ وہ سچ بھی بیچتا ہے۔ جھوٹ بھی بیچتا ہے۔ اور اکثر سچ کو جھوٹ کر کے اور
جھوٹ کو سچ کر کے بیچتا ہے۔ وہ عقل بیچتا ہے۔ ذہن بیچتا ہے۔ اعتقاد بیچتا ہے۔
ۃ نائیں بابا کا اعتقاد بیچتا ہے۔ اور اگر اسے کہیں سے خدا مل جاتا تو وہ اسے بھی ڈکری
ل رکھ کر گلی گلی کوچے کوچے بیچنے لگتا۔ خدا لے لو۔ دو آنے میں خدا لے لو۔ سستا لگا دیا
۔ دو آنے میں۔ گاہکوں کی خوشنودی کے لیے کمپنی کا دیوالہ نکال دیا۔ خدا لے لو
دو آنے میں۔ بازار میں رکھ کے آدمی خدا سے دشمنی مول لے سکتا ہے۔ مگر بازار
اصولوں سے غفلت ہرگز نہیں برت سکتا۔ اس غلطی میں بیچارہ ڈاکٹر بامنھ
دا گیا۔ وہ بازار میں ایک نئے ڈاکٹر کے جوش اور خلوص سے بیٹھا تھا۔ عوام کی خدمت
وں گا۔ خدمتِ خلق اور غریبوں کا بھلا اور نہ جانے کیا کیا اس نے سوچا تھا۔ وہ غریبوں
دوا بہت ہی کم داموں میں دیتا۔ اور اگر مریض بالکل ہی غریب ہوتا تو علاج مفت
کرنے لگتا۔ ہوتے ہوتے اس کی شہرت غریب محلوں میں پھیلتی گئی۔ اس شہرت کے ساتھ
ساتھ اس کا ادھار بھی بڑھتا گیا۔ غریب تو اس لیے نہیں دے سکتے تھے کہ وہ غریب
۔ لیکن امیر اس لیے نہیں دیتے تھے کہ جب ڈاکٹر اپنی شرافت سے وقت لے تو اس کا
ئدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ کیونکہ امیر لوگ تو ایسا کوئی کام نہیں کرتے جس میں ان
کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو وہ سرشتہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہوتے ہوتے ڈاکٹر کا متھ امیروں اور
غریبوں دونوں میں بہت مشہور ہو گیا۔ گھر کا کھانا پینا تھا۔ تو بہت ادھار والیس بھی
جاتا تھا۔ مگر بہت کم۔ پھر ڈاکٹر کا منھ نے یہ بھی دیکھا کہ جو غریب ہیں وہ بیچارے
کچھ بھی ان سے بن پڑتا ہے دیتے۔ لیکن جو امیر ہیں وہ اگر پہلے ہفتے میں نہ

دیں تو پھر برسوں نہیں دیتے اور اس خوش اسلوبی سے رقم ڈکار جاتے ہیں کہ ڈاکٹر کو محسوس بھی نہیں ہوتا۔ کہ یہ آدمی کبھی میرا مریض رہ چکا ہے۔ تین سال کے عرصے کے بعد ایک دن ڈاکٹر کامتھ کو چوروں کی طرح راتوں رات واگ پور سے بھاگنا پڑا۔ کیمسٹ کے ہاں اس قدر ہو گئے تھے۔ کہ ان کے ادا کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ سوا اس کے کہ چپ چاپ شہر چھوڑ دیا جائے۔ اور کسی دوسری جگہ ڈیرے ڈالے جائیں چنانچہ اب ڈاکٹر کامتھ تھوڑا سا سازوسامان لے کر اونتائیں بابا کی مورتی لے کر بمبئی جا رہا تھا۔ شاید اس کی قسمت وہاں چمک اٹھے۔

اس ڈھیلے کرتے والے نوجوان نے اپنے لانبے پریشان بالوں کو کنگھی سے آراستہ کیا۔ اور اپنے سر کو لاابالی پن سے جھٹک دیا۔ اسے ڈاکٹر کامتھ کی شرافت پر بہت ترس آ رہا تھا۔ جیسے آدمی کسی بے بس جانور کو دیکھ کر ترس کھانے لگے۔ کچھ ایسی ہی نظروں سے وہ ڈاکٹر کامتھ کو دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر کامتھ نے گھبرا کے کہا۔ "بھئی زخمی تم مجھے ایسی نظروں سے۔ نہ گھورو... کوئی چڑ یا گھر سے پکڑ کر نہیں لایا گیا ہوں۔"

"مجھے تو ایسے ہی معلوم ہوتے ہو" زخمی بولا "سوچتا ہوں تم بمبئی جا کر کیا کرو گے بہتر یہی ہے کہ اونتائیں بابا کی مورتی لے کر ہر دوار چلے جاؤ۔ کیونکہ تم خدمتِ خلق سے دلچسپی نہیں رکھتے۔"

زخمی بولا "میں شاعر ہوں۔ صرف شاعری سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ اور اپنے اس طوطے سے"

اتنا کہہ کر زخمی نے ہاتھ بڑھا کے قریب کے ہک میں ٹنگے ہوئے پنجرے کو اتارا۔

یہ پنجرہ لوہے کا تھا۔ مگر اس پر سنہری ملمع چڑھا ہوا تھا۔ یہ پنجرہ بہت بڑا تھا یعنی اتنا بڑا کہ اس کے اندر تین طوطے بڑی آسانی سے فری اسٹائل کشتی لڑ سکتے تھے مگر اس کے اندر ایک ہی طوطا بند تھا۔ اس کے ہرے پنکھ لال چونچ اور دم کے کاسنی پر۔ یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ نرائی کے علاقے کا شریف النسل کرناٹی طوطا ہے وہ اس وقت بڑے آرام سے آنکھیں موندے پنجرے کی بیچ کی کھونٹی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا (اس پنجرے میں تین کھونٹیاں تھیں) زخمی نسا نے پچکار کے جگایا جس طرح باپ اپنے سوتے بیٹے کو پیار سے جگاتا ہے۔ موتی۔ موتی۔ میری جان ۰۰۰۰ موتی!''

''سور کا بچہ۔ حرامزادہ!''

ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ پہلے تو چونکے پھر زور زور سے ہنسنے لگے زخمی نے مغرورانہ کے ادھر ادھر دیکھا۔ لگا ہوا ہی لگا ہوں میں داد طلب کر رہا تھا۔ پھر بولا

''میرا موتی ایسی صفائی سے گالی دیتا ہے کہ آگرے کا غنڈہ بھی کیا دے گا۔

اس کے بعد اس نے طوطے سے حاجی بلبلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''موتی ان کو ماں کی گالی دو''

موتی نے انہیں ماں کی گالی دی۔ بڑی پھڑپھڑ جارہ اور مرتبہ زخمی نے پھر دلیسائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''ان نہیں بہن کی گالی دو''

موتی نے دلیسائی کو بھی ایک بہن ہی بے نقطہ سنائی۔ ایسی بے نقطہ گالی دلیسائی نے اپنی زندگی میں کبھی سنی تھی۔ بیچارہ بھنّا گیا۔ مگر گالی دینے والا حیوان

تھا۔ اس لیے چپ رہ گیا۔

زخمی نے ڈاکٹر کا منتھ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اور انہیں کیا کہو گے موتی!

موتی نے اپنی لال لال چونچ کھول کر کہا۔

"بھیا جی پرنام"

"دیکھ لیجئے۔ کس قدر مہذب بھی ہے" زخمی نے کہا "اس کا لب و لہجہ دیکھئے کس قدر شستہ و رفتہ ہے۔ ہاں موتی ذرا ان لوگوں کو سورداس کی شاعری سناؤ۔

موتی اب لہک لہک کے گانے لگا۔

"کھیلت ہر نکلے۔ برج کھور ہی۔

گئے شام ادی جمنا تٹ۔ انگ ستی چندن کی کھور ہی۔

اوچک ہی دیکھی تنہہ رادھا۔

نین بشال بھال دے رد ری۔

اور شیام دیکھت ہی۔

نین نین ہی پری ٹھگوری"

زخمی نے کہا "دیکھا آپ نے، یہ ہے برج کی بولی کا رس۔ میں نے اس طوطے کے پڑھانے کے لیے شروع ہی سے جب یہ بالکل چھوٹا سا تھا، برج کے ایک کوئی کو نوکر رکھ لیا تھا تاکہ طوطے کا لب و لہجہ کہیں بگڑ نہ جائے۔ آپ جانتے ہیں مشاعروں اور کوی سمیلنوں میں جاتا ہوں۔ وہاں بھانت بھانت کی بولیاں سنتا ہوں گجراتی، پنجابی، مدراسی، بمبئی والے اور کہاں کہاں کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے میں نے

سوچا۔ کہیں اس طوطے کی زبان نہ بگڑ جائے۔ اس لیے اس کیلئے ایک استاد رکھنا پڑا۔ اس نے اس طوطے کو بڑی محنت سے پڑھایا ہے۔

"یہ گالیاں بھی اسی نے سکھائی ہیں کیا؟" ڈاکٹر کامنہ نے مسکرا کے پوچھا۔

"ارے نہیں جی۔ یہ گالیاں تو میں نے سکھائی ہیں۔ مگر آپ اس کی گالیوں پر نہ جائیں۔ یہ دیکھئے اس کی زبان کتنی صاف ہے۔"

"بالکل اہلِ زبان کا سا انداز ہے" نریندر نے کہا۔

"بالکل بالکل!" زخمی، نریندر کی طرف دیکھ کر اپنے طوطے کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "موتی! اب تم ہماری گود سے اترو۔ اور واپس وہیں چلے جاؤ۔ اپنی پرانی جگہ پر۔ بس بہت ہو چکا۔"

موتی نے کہا ـــ

"سؤر کا بچہ ـــ حرام زادہ!"

سب ہنسنے لگے۔ زخمی بھی ذرا کھسیانا ہو کے ہنسا۔ پھر بولا یہ طوطا مجھے بہت عزیز ہے۔ اس کی گالیاں، اس کا شعر پہ تخیل سجاد، اس کی ذہانت، سچ کہتا ہوں جب اکیلا ہوں۔ تو گھنٹوں اس سے باتیں کرتا ہوں۔ میں زندگی میں صرف دو چیزوں کو چاہتا ہوں۔ ایک اپنے طوطے کو دوسرے شاعری کو۔ بس اور کسی چیز سے مجھے دلچسپی نہیں ہے۔

کامنہ بولا ـــ "مگر آدمی کا شاعری کے علاوہ کوئی ایک نقطہ نظر بھی تو ہونا چاہیے"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے" زخمی بولا "جو میرا دل کہتا ہے بس میں وہی کرتا ہوں۔ وہی کرتا ہوں ـــ مجھے خدمتِ خلق اور اس قسم کے اور کسی ازم پر اعتقاد نہیں۔"

ہے۔ شوشلزم مارکزم۔ گاندھی ازم یہ سب فضول باتیں ہیں۔ انسان کو سوچنے سمجھنے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے"

"کیا اس میں جرم کرنے کی آزادی بھی شامل ہے؟" وکیلوں کی انجمن کا صدر بولا

"اگر لوگوں کو یہ آزادی حاصل نہ ہو تو تمہارا پیشہ کیسے چلے؟" زخمی نے جواب دیا۔

حاجی عیسیٰ ہنسنے لگے۔

"دلیپا بھائی بھائی! یہ اپنا زخمی بھائی بات تو اچھی کہتا ہے۔ شاعر ہے۔ مگر بات اچھی کہتا ہے"

"تم مجھے جیب کترا بنا کے چھوڑو گے" کامتھ نے بھی ہنس کے کہا۔

"جیب کترے بھی انسان ہیں" شاعر بولا "وہ اپنے پیٹ کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ جیب کترے کو جیب کترنے کی آزادی ملنی چاہیئے۔ پولیس کو جیب کترے کو پکڑنے کی آزادی حاصل ہے ہر شخص کو اپنے معاملہ میں آزاد ہونا چاہیئے اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک ہے نہ وہ غلط ہے وہ ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اور ہم اسے کسی طرح سے روک نہیں سکتے اس لیے انسان کو کسی ایسے وہم میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ یہ اچھا ہے وہ برا ہے۔ بس جو ہے سو ہے اور اگر نہیں ہے تو نہیں ہے۔ میں اس قسم کے تمام قسم کے تمام فلسفوں کے خلاف ہوں جو ادب میں اور زندگی میں اور انسان کے سوچ و بچار پر کوئی خاص ایسا فلسفہ عاید کرتے ہیں۔ دیکھو یہ دنیا اپنے تمام دکھوں کے باوجود کتنی سندر ہے۔ پھول خوبصورت ہیں۔ پتے ہرے ہیں۔ صبح سہانی ہے۔ راجکماری حسین ہے"

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ تم تو شعر کہہ گئے ہو۔" حاجی علیسی خوش ہو کے بولے
اب کوئی اچھی سی گجل سناؤ۔"

زخمی نے اپنے بالوں کو پھر ایک جھٹکا دیا اس نے پھر اپنے بالوں میں کنگھی کی۔
دیہاتی بھائی ـــ" ہاں ہاں زخمی بھائی۔ ذرا گا لے۔ اگلے دو اسٹیشن کے
بعد تم اتر جانے والے ہو۔ اس سے پہلے ہو جائے کوئی عاشقی معشوقی گجل۔"

زخمی نے خوش ہو کے اپنی بتیسی دکھائی۔ کنگھی کو جیب میں لٹکا۔ بالوں کو
پھر ایک زور سے جھٹکا دیا جس سے آراستہ بال پھر سے پریشان ہو گئے اور اس نے ڈبے
میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف بڑے غرور اور تکبر سے دیکھا اور بولا۔

"کب سے سوچ رہا تھا مشاعرے میں کیا پڑھوں گا۔ سب پرانی چیزیں ہیں۔
انہیں بار بار سنانا نہیں چاہتا۔ جی اوب جاتا ہے پھر اتنا بڑا مشاعرہ ہے ادھم پور
کے اسٹیشن پر دیکھنا کتنے لوگ مجھے لینے آئیں گے۔ والنیٹر مشاعرے کے منتظمین
اور دوسرے لوگ پھولوں کے ہار لیے آئیں گے۔ اور۔۔۔۔۔۔"

"ہاں ہاں! مگر گجل" حاجی علیسی زخمی کی عاجزی آکر بولے ـــ "اب دیر
نہ کرو۔ انتظار نہیں کر سکتے۔"

"زخمی نے کہا۔"

"جب سے ما چکاری کو دیکھا ہے۔ ذہن میں شعر ابھرنے لگے ہیں۔ ابھی
دو تین، دو جمے ہوئے ہیں۔ وہ سنائے دیتا ہوں۔"

زخمی پہلے تو دھیمے دھیمے گنگنایا۔ پھر اس نے بلند آواز میں شعر یوں پڑھے
جیسے اس کے سامنے چار آدمی نہ بیٹھے ہوں ـــ بچارہ اچھہ ہزار

آدمیوں کا مجمع ہو ——!

"اِس کو تگا کا شیر شک ہے —" بھولی راجکماری"

چوتھا باب

اپنے شاندار سیلون کی خواب گاہ سے راجکماری برآمد ہوئی اور ڈرائنگ روم کے ایک خوشنما صوفے پر بیٹھ کر مہادیوی ورما کی کوتا پڑھنے لگی۔

مالے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کا باڈی گارڈ بہادر سنگھ مودبانہ انداز میں خاموشی سے اٹھا اور راجکماری کے بیٹھنے کے بعد وہ بھی سامنے کے صوفے پر بیٹھ کر لائف میگزین میں نیویارک نائٹ کلب کی ایک نیم برہنہ رقاصہ کے فوٹو دیکھنے لگا۔ فوٹو دیکھتے دیکھتے وہ کنکھیوں سے کبھی کبھی راجکماری کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ سوچتا نیم برہنہ لباس میں راجکماری کیسے دکھائی دے گی۔ وہ دیر تک اس موضوع پر سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے سارے جسم میں گرمی کی ایک لہر دوڑنے لگی۔ اس عالم خیال میں اس نے راجکماری کے جسم سے ایک ایک کرکے سارے کپڑے

اتار لیے۔ اب راجکماری اس کے سامنے ننگی کھڑی تھی۔

"کویتا تو بڑی سندر ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی" یکایک راجکماری کتاب بیچ کر بولی۔

بہادر سنگھ عالم خیال سے بھاگ کر پھر اسی مودبانہ انداز میں راجکماری کے سامنے آ گیا۔ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔

راجکماری نے مسکرا کر کہا ——— کیا سوچ رہے تھے بہادر سنگھ؟"

"جی! جی! جی میں سوچ رہا تھا، اگلا اسٹیشن باجوہ ہے باجوہ کے لوگ ایک ایڈریس آپ کی خدمت میں پیش کرنے آ رہے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا آپ کو کیا کہنا چاہیئے

"ہم تو ان ایڈریسوں سے عاجز آ گئے۔ جسے دیکھو ہی سکول مانگتا ہے ہسپتال مانگتا ہے۔ زمین مانگتا ہے۔ ہم پر کیا ان کے باپ کا دینا آتا ہے"؟

"جی ہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر رسماً کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے"۔

"تو سوچ لو۔ ہم کیا دیں گے۔ مگر ہم تو بور ہو گئے ان کی باتیں سنتے سنتے۔ جی چاہتا ہے کہیں دور چلے جائیں"۔

"کہاں؟" بہادر سنگھ نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

راجکماری نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بڑے رومانی انداز میں کہا "کہیں دور... بہت دور......!"

بہادر سنگھ نے کھڑکی پر جھکی ہوئی راجکماری کی کمر کے خم کو بڑی دلچسپی سے دیکھا پھر نگاہ پلٹ کے رتانسہ کی تصویر دیکھنے لگا۔ اس نانٹ کا سب میں چلی جب اڈنا راجکماری۔ پھر ہم بھی تمہیں دیکھ لیں گے۔ سجانے

اندر ان کپڑوں کے اندر سے تم کیسی ہو۔ رانی کو تو دیکھا ہے اس سنگ مرمر کی کان کو تو دیکھا ہے۔ جس نے اس بت مرمریں کو پیدا کیا۔ لیکن تم کیسی ہو؟ نہ جانے کس کی گود میں جائے گی یہ موتی کی لڑی۔

ظلم، وہسکی اور بھنے ہوئے مرغ کا پلا ہوا نوجوان جاگیردار ایڈی کانگ بہادر سنگھ راجکماری کے جسم کے بارے میں سوچنے لگا۔ راجکماری کی اکتائی ہوئی نگاہیں کھڑکی سے پلٹ کر ڈرائنگ روم کے دوسرے کونے کی طرف گئیں۔ جہاں ایک خادمہ گلدان میں پھول سجا رہی تھی۔ راجکماری نے بلند آواز میں کہا۔

"گوپی ایک گلاس پانی لاؤ۔"

گوپی ایک گلاس پانی لائی۔ چاندی کا گلاس چاندی کی طشتری میں صاف پانی۔ ریفریجریٹر کا ٹھنڈا پانی۔ ایک گھونٹ پی کر راجکماری نے بڑی نخوت سے کہا۔

"پانی ٹھنڈا نہیں ہے۔ کہاں سے لائی ہو؟"

"حضور ابھی فریجڈیئر سے نکال کر لائی ہوں۔"

راجکماری نے پانی کا گلاس کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور خفا ہو کے پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ جیسے دنیا بھر سے اکتائی ہوئی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک فیصلہ کن لہجے میں بہادر سنگھ سے کہا۔

"تم باجوہ کے لوگوں سے اڈریس لے لینا۔ ہم ان کے سامنے نہیں جائیں گے۔ ہمارے سر میں درد ہے۔

راجکماری اپنے ہاتھ سے سینڈل کھولنے لگی۔ یکایک گوپی اور ایڈی کانگ دونوں ایک ہی جھٹکے سے آگے بڑھے۔ جیسے وہ انسان نہ ہوں۔ اسپرنگ

والے کھلونے ہوں۔ دونوں نے راجکماری کے سینڈل تھام لیے اور
تسمے کھولنے لگے۔

مہادیوی ورما کی اَدھ کھلی کتاب فرش پر پڑی تھی!

باتوہ کے اسٹیشن پر نربندا اور غلام رسول پھر اپنے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں واپس آگئے۔

ڈبے سے کچھ لوگ چلے گئے تھے۔ کچھ لوگ آگئے تھے جہاں لوہار کی بیوی اور اس کا شوہر بیٹھا تھا۔ ان کے سامنے ایک تلک دھاری برہمن اپنے سیاہ ماتھے پر سفید چندن کا لیپ کیے اپنے ننھے لڑکے کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کی بغل میں اس کی بیوی گھونگٹ میں اپنا چہرہ چھپائے ایک بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس کے پلو سے لگی ایک آٹھ سالہ کی بچی اپنی بہتی ناک کا لعاب اور ریوڑیاں ملا کر کھا رہی تھی۔ غلام رسول کو بہت غصہ آیا۔ تلک دھاری برہمن سے ڈپٹ کے بولا "آپ دیکھتے نہیں یہ ہماری سیٹ ہے۔" تلک دھاری برہمن نے

کہا۔ اس سیٹ پر تو کچھ نہیں لکھا۔ مگر اب آپ کہتے ہیں تو اٹھ جاتے ہیں
اٹھو بھاگوان"، برہمن اپنی بیوی سے بولا۔

بیوی گھونگٹ میں سے منمنائی۔

نریندر نے کہا۔ انہیں بیٹھا رہنے دو ہم کہیں اور بیٹھ جائیں گے۔ برہمن کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں نے پولیس کے سپاہی اور اس کے قیدی کیلئے جگہ دی اور یہ دونوں گھس پل کے ان کے درمیان بیٹھ گئے۔

جہاں نریندر کو بیٹھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ ملی وہاں بھیڑ پہلے ہی بہت زیادہ تھی۔ لیکن اسجگہ سے بہت قریب چار آدمی بڑے مزے سے سیٹوں پہ آلتی پالتی مارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہر ایک نے کم از کم تین آدمیوں کی جگہ روک رکھی تھی۔ بلکہ ان چاروں میں سے ایک آدمی تو تکیہ لگائے تقریباً لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا لیکن گاڑی کے دوسرے مسافروں کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ ان سے جگہ خالی کرنے کو کہیں۔ کیونکہ چاروں کے چاروں پہلوان تھے۔ اور دربار وارڈ کشتی لڑنے جا رہے تھے۔ ان میں جو پہلوان حقہ پی رہا تھا اسے دھاما سنارا کہتے تھے۔ دھاما کا سر گٹا ہوا تھا۔ ا آنکھ کانی تھی۔ اور کان اوپر کو چپکے ہوئے تھے۔ جیسے کسی نے گھونسے مار مار فلیٹ کر دیئے ہوں۔ دھامے کا چیلا گوپت اسی طرح سر گٹائے ہوگیا تنگ کا باندھے اپنے استاد کے پاؤں دبا رہا تھا۔ سامنے کی سیٹ پر فقیر پہلوان اپنے پٹھے کے ساتھ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے گلے میں سیاہ اور سرخ منکوں کی ا مالا تھی۔ کہتے ہیں فقیر پہلوان کسی زمانے میں سائیں دھیل شاہ کے مزار پہ مجاور تھا۔ سو دبلا پتلا پانچ وقت نماز پڑھنے والا چرس کا دم لگا کے بے تحاشا گالیاں بکنے والا

نخ دیدے گھما گھما کے بچوں اور عورتوں کو ڈرانے والا فقیر تھا اسے ہر وقت کھانسی ہوتی تھی۔ اور ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگا تھا۔ اور سنار کے دوسرے مجاوروں کا خیال تھا کہ فقیر اب جلد دوسرے جہان کو سدھار جائیگا۔ مگر لوگ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن سائیں دھبل شاہ فقیر کے مراقبے میں نظر آئے۔ اور انہوں نے فقیر کو چرس چھوڑ دینے کہا۔ اور اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا "جا بچہ اچرس چھوڑ دے اور گلے میں سرخ اور سیاہ منکوں کی مالا ڈال لے پھر تیری کھانسی ہمیشہ کیلئے دور ہو جائے گی۔ تیرا یہ دبلا پتلا جسم اس قدر بھر جائیگا۔ کہ تو مرنے سے پہلوانی کر سکے گا۔ تجھے دنیا کا کوئی پہلوان نہیں گرا سکے گا۔ جا بچہ اٹھ یہ مجاوری چھوڑ دے اور سائیں کا پہلوان ہو جا"۔ کہتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے فقیر نے چرس چھوڑ دیا۔ مجاوری بھی ترک کر دی گلے میں سرخ اور سیاہ منکوں کی مالا پہن لی اور جگہ جگہ کشتیاں لڑنے لگا۔ چونکہ اس کی پیٹھ پر سائیں دھبل شاہ کی تھپکی تھی۔ اس لئے وہ اب تک کسی دنگل میں نہیں پچھڑا تھا۔ جیتتا ہی چلا گیا فقیرا کا رنگ گورا۔ اور کسرت سے کندن کی طرح چمکتا تھا۔ بخلاف اس کے دھامے سنار کا رنگ مشکی تھا۔ اس کی ایک آنکھ کانی تھی۔ اور اس کی پنڈلیاں بھی پتلی نظر آتی تھیں۔ مگر دھامے سنار اپنے علاقے کا بہترین پہلوان سمجھا جاتا تھا۔ جتنے داؤ پیچ اسے یاد تھے۔ بہت کم پہلوان اس میں اس کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ دوسرے پہلوان وزن، قد اور جسم میں بھاری بھرکم ہوتے ہوئے بھی اس سے مات کھا جاتے تھے۔ کہتے ہیں کوئی بڑے سے بڑا پہلوان آخیک دھامے سنار کی پیٹھ زمین سے نہ لگا سکا تھا۔ اس لئے دھامے سنار اور فقیرا کا جوڑ بہت عمدہ سمجھا گیا۔ اور دربار واڑہ میں ہونے والے دنگل کی دھوم دور دور تک تھی۔ فقیرے نے دھامے

سنار کی طرف دیکھتے ہوئے ایک چبھتی ہوئی مسکراہٹ سے کہا " پہلوانی میں تمباکو۔۔۔ اچھا نہیں ہوتا۔ سانس چھوٹا ہو جاتا ہے۔"

" سانس چھوٹا ہو جاتا ہے مگر دل بڑا ہو جاتا ہے "۔ دھانے سنار کے بیٹھے گوپت نے اپنے کندھے پھیلاتے ہوئے کہا۔

گوپت کا قد چھوٹا تھا۔ مگر وہ لمبائی میں جتنا کم تھا چوڑائی میں اتنا ہی زیادہ تھا اس کی گردن ایک مینڈھے کی طرح مضبوط تھی۔ اور رانیں چوڑی چکلی۔ تاکہ وہ ایک دوسرے سے رگڑ نہ کھائیں وہ انہیں ایک دوسرے سے دور پھیلا کر بطخ کی طرح چلتا تھا۔ وہ کیا اکثر پہلوان اسی طرح اینڈ اینڈ کر چلتے ہیں۔

دھانے کی ہاں آنکھ اپنے بیٹے کی بات پر اور بھی کافی سکڑی اور سیاہ نظر آنے لگی اس نے فقیرے کے جسم کا غور سے جائزہ لیتے ہوئے کہا " میرے تمباکو میں تو چرس کا دم بھی ہے۔

" توبہ۔ توبہ" فقیرے نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ چرس تو بہت بری بلا ہے۔ سائیں بادشاہ نے جس دن سے مجھے حکم دیا ہے چرس نہ پیو اس دن سے دیکھو میری کتنی اچھی حالت ہو گئی ہے چرس پینے والا پہلوان تو میرے سامنے بالکل ہی نہیں ٹکتا۔

" دیکھیں گے۔ دنگل تو ہونے دو " گوپت نے پھر اپنے بازوؤں کی مچھلیاں پھیلا کر گھمائیں۔ اس کی گردن تن گئی۔ اور اس نے گھور کر معراجدین کی طرف دیکھا۔ جو فقیرے کا پٹھہ تھا۔ اور اب تک خون کے گھونٹ پئے خاموش بیٹھا تھا۔ معراج کا جی چاہا۔ وہ ابھی گوپت کو اٹھا کر گاڑی میں پٹخ دے اسے زیادہ باتیں کرنے

کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے جوں ہی وہ اپنی سیٹ سے اٹھا فقیرے نے ہاتھ کی ایک ہلکی سی جنبش سے اسے روک دیا۔ بولا ہاں بھئی تم ٹھیک کہتے ہو۔ دنگل تو ہونے دو۔ وہیں تو فیصلہ ہو گا۔"

معراج بولا "میرے استاد کو سائیں وصل شاہ کی تھپکی ملی ہے۔ ابھی تک کوئی ماں کا لال پیدا نہیں ہوا۔ جو میرے استاد کی پیٹھ زمین سے لگا سکے۔"

دھامے نے کہا "بیٹا ہم تو کسی سائیں پہ عقیدہ نہیں رکھتے۔ دھوبی پٹڑے پہ یقین رکھتے ہیں۔"

دھامے کا دھوبی پٹڑا اس کا مشہور داؤ تھا۔ اور دور دور تک مشہور تھا کہ کوئی پہلوان اس کے داؤ میں آ گیا تو چاروں شانے چت گر جاتا تھا۔ پھر اس کے اس داؤ سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوتی تھی۔

فقیرے نے اپنی ران پہ ہاتھ مار کر کہا۔ "اپنا موتی چور بھی دیکھنا۔ دن کو تارے دکھا دیں گے۔ کوئی چرسیا پہلوان نہیں ہیں۔ برانڈی پیتے ہیں۔ اصل فرنچ برانڈی کا۔ دو پیگ پی کے آدمی شیر کی طرح دنگل میں بڑھتا ہے۔ نکالنا بیٹے معراج وہ بوتل ذرا سی ہم بھی چکھ لیں۔"

"مگر دنگل تو ابھی بہت دور ہے ابھی تک کیا ضرورت پڑ گئی۔" دھامے نے وہیں اپنی سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے کہا۔ اس کے چہرہ پہ ایک بدصورت اور خطرناک مسکراہٹ پھیل گئی۔

فقیرے نے پانی ملائے بغیر برانڈی کا ایک پیگ لے لیا بولا۔ بھائی جب چرس یاد آتی ہے برانڈی پینا پڑتی ہے۔ اور تم تو میرے سامنے چرس کا دم لگا کے

پی رہے ہو۔"

اس بات پر سب پہلوان ہنس پڑے اور معاملہ ٹل گیا۔

دو چھوٹے چھوٹے سندھی لڑکے نارنجی رنگ کی کھٹی میٹھی گولیاں بیچتے ہوئے سیٹوں پر سے گزرتے ہوئے ادھر آ رہے تھے۔ دونوں باآوازِ بلند ایک ساتھ بولے

"گولیاں۔"

کھٹی میٹھی
ٹھنڈی میٹھی
گولیاں
رس بھری
مصس بھری
گولیاں
ایک پیسے کی تین
ایک آنے کی بارہ
گولیاں"

ان کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ چہرے بے حد میلے۔ کپڑے بھی بیحد میلے اور بیچنے کی معصومیت میں ایک عجیب قسم کا تجارتی پن جھلک رہا تھا۔ جیسے وہ قبل از وقت بہت سی باتوں سے آشنا کر دیئے گئے ہوں وہ علم جو وقت پر ملے اکثر مسرت آشنا ہوتا ہے۔ وہ تجربہ جو وقت سے پہلے حاصل ہوتا ہے کبھی کبھی ناسورِ غم بن جاتا ہے ان دونوں سندھی لڑکوں کے چہرے نہ بچوں کے سے تھے نہ بڑوں کے سے۔ اُن میں۔

دونوں زمانوں کی آویزش اور آمیزش تھی۔ کشمکش تھی اور کرب تھا اور انہیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ ایسے چہرے پیدا نہیں ہو سکتے۔ اگر کہیں پر کوئی غلطی نہ ہو۔ لیکن کہیں نہ کہیں کوئی غلطی موجود ہے۔ نریندر سوچنے لگا۔ زندگی میں وقت کے دھارے سے کہیں پر کوئی غلطی ضرور موجود ہے۔ نریندر سوچنے لگا۔ ورنہ ان چہروں کا مطلب کیا ہے؟ یہ چہرے بچوں میں اجنبی تھے۔ اور بوڑھوں میں انجانے۔

گولیاں
کھٹی میٹھی
ٹھنڈی میٹھی
گو . . . . . .

یکایک دونوں لڑکوں کی آوازیں اس طرح بند ہو گئیں۔ جیسے کسی نے دفعتہً ان کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا ہو۔ نریندر نے ان بچوں کی طرف دیکھا اور اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اب وہ دونوں بچے اس گاڑی میں کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک چھلاوے کی طرح کہیں گم ہو گئے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے وہ سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ اس ایک لمحے میں وہ دونوں بچے گم ہو گئے۔ اور پھر اس نے دیکھا کہ لوگ آپ ہی آپ مسکرا رہے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ سامنے ایک ٹکٹ چیکر ٹکٹ دیکھنے کے لیے دروازے کے اندر داخل ہو کے ٹکٹ دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ٹکٹ چیکر ٹکٹ چیک کر کے گاڑی کے دوسرے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اور چلتی گاڑی سے ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں جانے کی سعی کرنے لگا۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ یا نہ جانے کیا بات تھی اس نے کچھ عرصہ کے لیے

اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ پھر وہ جیب سے ایک سگریٹ نکال کے سگریٹ پینے لگا۔ اتنے میں گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ کم ہوتی گئی۔ مسافر کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگے کہیں کوئی اسٹیشن تو نہیں آ رہا تھا۔ یہاں پہ ریلوے لائن کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے گاڑی بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ٹکٹ چیکر اس ڈبے سے اتر کر دوسرے ڈبے میں چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی ایک سیٹ کے نیچے سے دونوں سندھی لڑکے سر نکال کے مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے اور پھر ایک ساتھ گا نے لگے۔

"ٹھنڈی ٹھنڈی میٹھی گولیاں"

"ایک پیسے کی تین اور ایک آنے کی بارہ"

بہت سے مسافر ہنسنے لگے۔ بیشتر مسافروں کو گولیوں کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ ان لڑکوں کی سیٹ کے نیچے چھپ جانے کی شرارت سے بہت محظوظ ہوئے۔ اور اسی مسرت میں انہوں نے ان لڑکوں سے بہت سی گولیاں خریدیں اور اس کے بعد ان دونوں لڑکوں میں سے جو چھوٹا تھا اس نے اپنے بڑے لڑکے سے سندھی میں کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب میدان صاف ہے ٹکٹ چیکر اگلے ڈبے میں چلا گیا ہے کیوں نہ ہم پچھلے ڈبے میں چلے جائیں۔ وہ دونوں لڑکے دروازہ کھول کر پچھلے ڈبے میں جانے لگے۔ چند ایک مسافروں نے انہیں روکنا چاہا۔ مگر گاڑی کی رفتار بہت کم تھی اور وہ دونوں منجھے ہوئے، مشتاق اور تجربہ کار تھے بڑی آسانی سے پچھلے ڈبے میں چلے گئے۔ لوگ بہت دیر تک ان کی شرارت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ذکریا کٹنگٹن کی گولیوں سے تامان سینوں کی گولیوں کا رنگ لے کر آیا۔ وہ اسے سرمہ اکسیر چشم کی طرف لیٹا۔ دس سال

پہلے اس گاڑی میں ایک بڈھا سادھو ایک سرمہ بیچا کرتا تھا۔ سرمہ اکسیر چشم۔ واہ وا۔ کیا سرمہ تھا۔ موتیا بند تک کو ٹھیک کر دیتا تھا۔ ایک بڈھا بڑھئی ایک بڈھے پارسی سے کہہ رہا تھا۔" ایسا سرمہ تھا صاحب ایسا سرمہ تھا کہ اگر کبھی غلطی سے آنکھ کے بجائے کان میں لگ جائے تو کان دیکھنے لگ پڑیں۔ آس پاس کے مسافر ہنسنے لگے اس پر بڈھے بڑھئی نے غصہ میں آ کر کہا۔

جھوٹ نہیں کہتا ہوں۔ آنکھوں دیکھی بات ہے جادو کا سرمہ تھا جادو کا سرمہ اور صرف آٹھ آنے میں بیچتا تھا۔ آجکل تو یہ گاڑی میں بیچنے والے بالکل چور اور ٹھگ ہیں۔ وہ ہمارے زمانے گئے۔ ان زمانوں کی بات اور تھی۔ وہ زمانے اب نہیں آئینگے اب کیا آئیں گے" بڈھے پارسی نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا" ان دنوں چھیا ڈنی میں میرا شراب خانہ تھا۔ میرے بار میں ایک ایک انگریز سپاہی پانچ پانچ روپے ٹپ دے جاتا تھا اور آجکل وہ بڈھا پارسی طنزیہ طریقے پر ہنسا۔ جیسے اپنے سامنے ملکہ برطانیہ کی بجائے کسی بھیک مانگتے ویسا ئی کو دیکھ لیتا ہو۔

گاڑی کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔

غلام رسول نے پنڈت جی کی طرف دیکھا۔ جو اس کے سامنے چندن لگائے بڑے اطمینان سے بیٹھے آہستہ آہستہ مسکرا رہے تھے۔

غلام رسول نے پوچھا۔

" پنڈت جی کہاں جا رہے ہو؟"

" دریا دائرہ مہاراج "

" کیا کرنے ہو؟"

"پنڈتائی کرتے ہیں۔ جوتش لگاتے ہیں۔ ہاتھ دیکھتے ہیں۔ اناج کا سستا مندا بتاتے ہیں۔ وہاں دربار واڑہ مہاراج میں اناج کی منڈی ہے۔ وہاں چند سجّن پرش ہمیں مانتے ہیں۔ ان کے ہاں جا رہے ہیں۔"

"اچھی خاصی رقم مل جاتی ہو گی۔ پنڈت جی؟" لوہار نے پوچھا۔

"نہیں بھائی! آج کل جوتش میں کچھ نہیں پڑا ہے۔ ہاتھ دکھانے والے بھی نہیں ملتے۔ اور ملتے ہیں وہ بہت کم پیسے دیتے ہیں۔ لے دے کے یہ اناج کا جوتش رہ گیا ہے۔ اس کی تیزی مندی سے گھر کا خرچ چلتا ہے۔"

"تو آپ مندر میں بھگوان کی پوجا کیوں نہیں کرتے؟" نریندر نے پوچھا۔

"پہلے وہی کرتے تھے۔ مگر آج کل مندر میں بھگت لوگ کم آتے ہیں ہمارے چندراوتی شہر میں جب سے سینما بنا ہے۔ ہمارے مندروں میں ایک تہائی سے کم شردھالو بھگت رہ گئے ہیں۔

"تو کیا گویا مندر برباد ہو رہے ہیں۔ اور سینما آباد ہو رہے ہیں" نریندر نے پوچھا۔

"کل جگ ہے" پنڈت جی ایک گہری سانس لے کر کہا۔ آج کل جدھر دیکھو جعل اکیٹ دھوکا۔ اور پیسہ کہیں ڈھونڈے نہیں ملتا۔ اور جب ہمارے ججمانوں کے پاس پیسہ نہیں ہو گا۔ تو غریب پنڈتوں کو کون دے گا۔"

"معلوم ہوتا ہے آج کل دھرم کے بازار میں بھی مندہ ہے۔ اسی لئے آپ نے بھگوان کی اُپاسنا چھوڑ دی ہے۔" نریندر نے خفیف سا طنز یہ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی" پنڈت جی بولے "بھگوان تو دن رات ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔" پنڈت نے اپنی سیٹ پہ ایک جوگیا رنگ کے کپڑے میں لپٹی ہوئی مورتی کی طرف اشارہ

کرکے کہا "ہم تو رات دن اپنے بھگوان کی اپاسنا کرتے ہیں۔ یہ تو برہمن کا دھرم ہے"
"مگر اس تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے تو آپ کے بھگوان بھرشٹ ہو گئے ہوں گے۔ دیکھئے یہاں تو ہر مذہب کے لوگ بیٹھے ہیں"
"تو کیا ہوا!" پنڈت جی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ جب ہم سفر میں جاتے ہیں تو اپنے ساتھ ہمیشہ گنگا جل رکھتے ہیں"۔ پنڈت جی نے ایک چھوٹے سے گنگا جل کے پیپے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر نریندر بولا۔
"پنڈت جی ذرا میرا ہاتھ تو دیکھئے قسمت کیا کہتی ہے؟"
"پنڈت جی نے مسکرا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ مگر قیدی کے ہاتھ ہتھکڑیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ ٹھیک طرح سے بڑھایا نہ جا سکا تھا۔ پنڈت جی نے پولیس کے سنتری سے کہا "بھئی اس کے ہاتھ کھول دو۔ یہ گاڑی سے کہاں بھاگ جائیگا۔ ہم اس بیچارے کا ہاتھ دیکھ دیں گے۔ اس کے بعد اسے باندھ لینا۔ بس دو منٹ کے لیے کھول دو نا"
غلام رسول نے چابی لگا کے ہتھکڑیاں کھول دیں۔ نریندر نے ایک عجیب مسرت سے اپنے آزاد ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ کلائیوں پر ہتھکڑیوں کے سرخ نشان تھے نریندر نے انہیں انگلیوں سے دبا کے مٹانے کی کوشش کی۔ اپنی انگلیاں چٹخائیں اپنی ہتھیلیاں کھولیں۔ اور بند کیں۔ جیسے ایک محبوس طائر پنجرے سے باہر نکل کے اپنے پر تولتا ہے۔ اور حیرت و مسرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ بالکل یہی حالت اس وقت نریندر کی تھی۔ اگر اس وقت اس کے کندھوں پر پر ہوتے تو وہ ایک تیر کی طرح سنسناتا ہوا

کھڑکی سے باہر اڑ جاتا۔

گاڑی اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی بے بس نریندر اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کیونکہ وہ پرندہ نہ تھا۔ جوتشی نے نریندر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی ہتھیلی کھول کر قسمت کی لکیریں غور سے دیکھنے لگا۔ غلام رسول بڑی دلچسپی سے آگے کو جھک گیا لوہار اور اس کی بیوی بھی قیدی کی قسمت کا حال سننے کے لئے پنڈت جی کی قریب کھسک آئے۔ آمنے سامنے کے چند مسافر بھی سیٹیں چھوڑ کر اور گاڑی کے اوپر کے تختوں کا سہارا لے کر جہاں مسافروں کا سامان رکھا تھا کھڑے ہو گئے اور بڑی دلچسپی سے قسمت کا حال بتانے والے کی باتوں کا انتظار کرنے لگے۔ پنڈت جی نے دو تین بار نریندر کی قسمت کی لکیروں پر ہاتھ پھیرا۔ لوگ اور آگے جھک گئے۔ اس طرح گویا ابھی ماضی، حال، اور مستقبل کے اسرار اور رموز آشکارا ہونے والے ہیں۔

گاڑی اپنی قسمت کی لکیروں پر چلی جا رہی تھی۔

پنڈت جی نے اپنے گلے کو کھنکار کر صاف کیا۔ لنڈ سے پر پڑے ہوئے رام نام کے انگوچھے کو ٹھیک کیا۔ ادھر ادھر مسافروں کی طرف بڑے گمبھیر انداز میں دیکھا۔ اور پھر بہت بن کے سنجیدہ انداز میں بولے ——

"تمہاری قسمت . . . . . . "

یکایک گاڑی کو ایک شدید دھکا لگا۔ کھٹاک، کڑاک، دھائیں، دھم، ہزاروں بندوقوں اور توپوں کے چلنے کی سی آواز آئی جیسے بادل گرج رہے ہوں اور زمینیں پھٹ پڑیں۔ اور جنگلوں کے درخت کٹ کر ایک دوسرے پر گر پڑے ہیں۔ نریندر کو ایک لمحے کے لیے گاڑی کی چھت نیچے اور فرش اوپر کو جاتا ہوا معلوم ہوا۔ جیسے وہ کسی گاڑی میں

نہیں۔ کسی ہنڈولے میں سفر کر رہا ہے۔ ایک لمحے میں اس نے گاڑی کے ڈبے میں مسافروں عورتوں، مردوں، بچوں کو ایک دوسرے پر گرتے ہوئے دیکھا۔ ٹین کے ڈبوں۔ آہنی ٹرنکوں بھاری صندوقوں کو چیختی ہوئی سیٹوں سے اچھلتے، گرتے پڑتے، مسافروں سے ٹکراتے، دن کو رات اور رات کو دن میں ڈوبتے ہوئے شمال و جنوب مشرق و مغرب چاروں سمتوں کو ایک دوسرے میں گھومتے ہوئے دیکھا۔ شور غل آہ و بکا چیخیں ماتم ایسے پھر جیسے کسی ہاتھ نے اسے آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا ہو۔ یکایک اس کے ذہن کی ساری روشنیاں گل ہو گئیں۔ اور اس کے احساسات پر مکمل اندھیرا چھا گیا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے اپنے آپ کو ریل کی لائن سے کئی فٹ دور ریتیلے گڑھے میں گرا پایا۔ چند لمحوں تک وہ چپ چاپ اسی گڑھے میں پڑا رہا۔ پہلے تو اس نے اپنے ہاتھ بھی نہیں ہلائے۔ شاید وہ خاموشی سے اپنے آپ سے معلوم کر رہا تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے۔

جب اسے اچھی طرح سے اطمینان ہو گیا کہ وہ زندہ ہے تو اس کے بعد بھی کئی لمحوں تک چپ چاپ، آنکھیں بند کئے جیسے آس پاس کی چیخوں سے کوئی علاقہ نہ ہو اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ اپنے اعضا ہلائے۔ پہلے آنکھیں کھولیں پھر ہونٹ ہلائے۔ پھر گردن ہلائی۔ پھر بازو ہلائے۔ پھر ٹانگیں ہلائیں اور جب اس

نے یہ جان لیا کہ وہ بالکل صحیح سلامت ہے تو زندگی کی خوشی اور مسرت کا بھرپور احساس چند لمحوں کے لیے اس کی روح اور جسم کے ریشے ریشے میں ابھرتے ہوئے طوفان کی طرح سرایت کر تا گیا۔

تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ ٹوہ کر وہ گڑھے سے باہر نکلا۔ پہلے آہستہ آہستہ پھر تیزی سے ریل گاڑی کی گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد وہ گاڑی کی طرف دوڑ رہا تھا۔

چھٹا باب

جب وہ ریل کے قریب پہنچا تو اس نے عجیب منظر دیکھا۔ انجن گاڑی سے کٹ کر ریت کے ایک لمبے ٹیلے میں گھس گیا تھا۔ اس کا آدھا حصہ ریت کے باہر تھا۔ انجن کے بعد دو ڈبے ایک وہ جس میں نریندر بیٹھا تھا اور دوسرا اس سے پہلے والا دونوں ایک دوسرے پر یوں چڑھے بیٹھے تھے۔ جیسے دو پہلوان کشتی کے لیے گتھم گتھا ہوں۔ بعد کے تین ڈبے صحیح سلامت تھے۔ ان میں ایک وہ ایرکنڈیشنڈ ڈبہ بھی شامل تھا۔ اس بعد راجکماری کا سیلون پٹڑی سے اتر کر زمین پر گر پڑا تھا۔ اور اس کے بعد ساتھ والا …کلاس کا ڈبہ بھی۔ پھر دو ڈبے صحیح سالم تھے۔ اور پٹڑی پر یوں کھڑے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے بعد آخر کا ڈبہ پھر گاڑی سے کٹ کر زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ چاروں بھاگ دوڑ چیخ و پکار بدحواسی اور پریشانی کا عالم تھا۔ لوگ ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے

کی طرف بھاگ گئے۔ اور پھر واپس دوڑ پڑتے تھے۔ وہ روتے روتے اپنے عزیزوں کو بلاتے جاتے تھے اور پٹڑی کے ساتھ بھاگتے جاتے تھے۔ اور جس عزیز کو وہ بلا رہے تھے وہ ان کے پیچھے دوڑتا ہوا ان کا نام لے لیکر روتا ہوا بھاگ رہا تھا! اور کوئی ایک دوسرے کو پہچانتا نہ تھا۔ موت کے سایے نے امتیاز ہی تو مٹا دیا تھا۔ اور اس عظیم بدحواسی کے پہلے لمحوں میں باپ بیٹے کے چہرے کو اور بیٹا باپ کے چہرے کو پہچان نہ سکتا تھا۔ بہت سے لوگ اپنے آپ کو زندہ پاکر بہت خوش ہوئے۔ اور رو رو کر ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ گلے ملنے کے ان کا دھیان فوراً اپنے مال و اسباب کی طرف گیا اور وہ لوگ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے حادثوں سے بے نیاز ہو کر جلدی جلدی اپنا سامان نکال رہے تھے۔ اور اس جلدی میں دوسروں کا سامان بھی اتارے لے رہے تھے۔ جس پر دوسرے مسافر جھگڑا کرنے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں کئی لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ اور نوبت گالی گلوچ سے گزر کر ہاتھا پائی پر آگئی تھی۔

نریندر یہ سب کچھ دیکھتا ہوا غلام رسول کو ڈھونڈتا ہوا بھاگ رہا تھا۔

"غلام رسول، غلام رسول!"

وہ کیوں چیخ رہا تھا۔ کس کے لیے چیخ رہا تھا۔ قیدی زنجیر کیلئے کیوں چیخ رہا تھا۔ پرندہ پنجرے کے لیے کیوں بے قرار ہو رہا تھا۔ صید صیاد کے لیئے کیوں پریشان ہو رہا تھا۔ "غلام رسول۔ غلام رسول"

بھاگتے ہوئے نریندر نے سوچا! غلام رسول پنجرے کا مالک تو نہیں ہے۔ یہ آہنی سلاخیں اسکی لکڑی کی بھی نہیں ہیں وہ بیچارہ زنجیر کا ایک بے بس حلقہ ہے۔ "وہ تو طوق برداروں میں سے ہے طوق تعمیر کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔ پولیس کی حوالات نقب"

نے کروہ ریل کے حادثے تک غلام رسول سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ ایسے غلام رسول
آیا تھا۔ غلام رسول ایک اچھا آدمی تھا۔ اس کی بھوری داڑھی اور کشادہ پیشانی
سے بہت پسند تھی۔ اس کے سخت لہجے کے اندر موجود کبھی کبھی ایک معصوم مہربانی
جھلک دیکھتا تھا۔ تو سوچتا تھا۔ اگر غلام رسول کے بس میں ہوتا تو وہ پولیس کا ایک
پاہی نہ ہوتا۔ شاید کسی اسکول کا ٹیچر ہوتا۔ یا مسجد میں ملا ہوتا۔

"غلام رسول، غلام رسول۔" نریندر چلایا۔

اس کی آواز دوسری ہنگامی آوازوں میں گم ہو کے رہ گئی۔ یکایک اس نے اپنے آپ
راجکماری کے شاہی سیلون کے سامنے کھڑا پایا جہاں بہت سے لوگ آپس میں کھڑے
تیں کر رہے تھے۔ نریندر ان میں گھس کے آگے بڑھ گیا۔

بہادر سنگھ ایڈی کانگ کا سر ایک کھڑکی کے نیلگوں شیشے سے ٹکرا کر باہر آ گیا تھا۔
اس کے پاؤں دوسری کھڑکی میں پھنسے ہوئے تھے۔ اور بیچ کا جسم سیلون کی دیوار سے
چپکا ہوا تھا جیسے کسی نے سریش سے چپکا دیا ہو۔ بہادر سنگھ کی آنکھیں بند تھیں
اس کی گردن ایک طرف کو لٹک رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک
لائف کا پرچہ جس میں ننگی رقاصہ کی تصویر تھی۔

"بیچارہ" لوگ آہستہ آہستہ افسوس کر رہے تھے۔ لیکن آگے بڑھنے
لیے کوئی تیار نہ تھا۔

"جانے راجکماری کا کیا ہوا؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

دوسرے نے جواب دیا۔ "کیا ہوا اس خوفناک حادثے میں پھول سا جسم
بچ سکتا ہے۔ اس سیلون کے اندر ہی کہیں ہے۔ بیچاری کی لاش پڑی ہو گی۔

ہائے ہائے کیسی نازوں کی پالی ہوئی راجکماری تھی۔"

"مگر کسی نے اندر جاکے دیکھا بھی ہے؟" نریندر نے پوچھا۔

"کس میں ہمت ہے جو اندر جائے" ایک کلرک آدمی بولا "تم ہمت ہو تو اندر جاؤ!"

دوسرا آدمی بولا "راجہ جی کا سیلون ہے اندر جاکے نہ معلوم کیا ہو جائے کل کلاں کو راجہ صاحب اپنے کوپوری کے الزام میں نہ پکڑوا دیں۔ چلے تھے نیکی کرنے۔۔۔۔۔"

نریندر نے اس کا فقرا پورا نہیں سنا۔ اس نے سیلون کے دروازے کو زور سے کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ نریندر نے بہت کوشش کی مگر دروازہ اندر سے نہیں کھلا۔

آخر میں نریندر کو ایک تجویز سوجھی۔ اس نے پتھر مار کر ایک کھڑکی کو توڑ دیا۔ اور اس سے چھلانگ کر اندر چلا گیا۔

اگر ایک سجا سجایا گھر کروٹ بدل کر زمین پہ سو جائے تو اس وقت اس گھر کی کیا حالت ہوگی۔ بس یہی حالت اس وقت اس خوبصورت سیلون کی تھی۔

چھت زمین سے لگی ہوئی۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں آسمان کی طرف تک رہی تھیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے پردوں کو ابھی تک سرسرا رہے تھے۔ غالیچے پھولدان اوندھے پڑے تھے۔ میز الٹی پڑی تھی۔ اور میز پر رکھا ہوا شمعدان میز پر نہیں بلکہ سیلون کے ایک آہنی ہک پر الٹا لٹک رہا تھا۔

ایک کونے کی دو دیواریں چمک گئی تھیں۔ ادھر ایک دروازہ تھا۔ دروازے

سے ایک بڑی سی میز سرک کر اوندھی ہو گئی تھی اور اس پر سجے ہوئے چینی کے برتنوں
کا انبار فرش پر ٹوٹا پڑا تھا۔

نریندر گھٹنوں کے بل آگے بڑھتا گیا۔ قالیچے پر چلتے چلتے یکایک اس کا ہاتھ
سی سیاہ چیز سے گیلے ہو گئے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ لہو نہیں تھا۔ پانی تھا۔ اور
اس پانی میں دو رنگین مچھلیاں ہولے ہولے سانس لے کر مر رہی تھیں۔ نریندر نے دیکھا
قریب ہی وہ بلوریں کانچ کا برتن ایک طرف ٹیڑھا ہوا پڑا تھا۔ اس میں ابھی کچھ پانی باقی
تھا۔ اور باقی کی مچھلیاں اس میں اس طرح تیر رہی تھیں۔ جیسے انہیں اس حادثے کی
خبر نہ ہو۔ حیرت ہے اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور یہ کانچ کا برتن نہیں ٹوٹا۔ نریندر نے سوچا
اور اس لمحے میں سوچتے ہوئے اس نے فرش پر تڑپتی ہوئی دونوں مچھلیوں کو اٹھا کر کانچ کے
برتن میں ڈال دیا تھا۔ اور برتن سیدھا کر دیا۔ مگر وہ رنگین مچھلی کہاں ہے؟ وہ مونگے اور سیپ
محلوں میں رہنے والی جل پری۔۔۔ وہ راجکماری کہاں ہے؟ اس نے پلٹ کر چاروں
طرف دیکھا اسے کہیں راجکماری نظر نہ آئی۔ وہ ناامید ہو کر سیلون سے باہر نکلنے والا تھا۔ کہ
الٹے لٹکے ہوئے شمعدان کے قریب خواب گاہ کا دروازہ نظر آیا۔ اور وہ گھٹنوں
بل چلتا ہوا گرے ہوئے فرنیچر سے بچتا ہوا خوابگاہ کے اندر داخل ہو گیا۔

موتیوں کی جھالریں، حریری پردے، اطلسی صوفے ریشمی۔ خاموشی ایک لمحے کے لئے
ان چیزوں کا احساس نریندر کے ذہن پر چھا گیا۔ دوسرے لمحے اس نے ایک مرصع اور
پلنگ کے نیچے ایک مرمریں ہاتھ دیکھا۔ انگلیوں کی پوریں سرخ تھیں اور کلائی
ہیرے کا کنگن چمک رہا تھا۔

نریندر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا پلنگ کے قریب آ گیا۔ پلنگ کے نیچے ایک لڑکی دبکی

پڑی تھی۔ اور اپنی بڑی بڑی سیاہ اور خوفزدہ آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
صبح تک نریندر اور راجکاری دونوں پلنگ کے نیچے گھٹنوں کے بل پڑے ہوئے
ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر نریندر نے مسکرا کر کہا۔

"آؤ راجکاری"۔

راجکاری نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔
نریندر نے ہاتھ آگے بڑھا کے کہا "آؤ باہر آؤ"۔

راجکاری خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

نریندر نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں
بچ گئی ہو۔ آؤ میں تمہیں باہر لے جانے آیا ہوں"۔

راجکاری گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی پلنگ کے نیچے سے باہر چلی آئی نریندر
اسے سہارا دیا۔ یکایک راجکاری ایک ٹھنڈا سانس لے کر بے ہوش ہو گئی۔

نریندر نے راجکاری کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ وہ صبیح صورت
مرمر کی مورت اس کے ہاتھوں میں ایک بے جان ساز کی طرح پڑی تھی نریندر کبھی اٹھ
چلتا ہوا کبھی گھٹنوں سے گھسٹتا ہوا۔ راجکاری کو ہاتھوں میں اٹھائے کبھی کندھے پر
خواب گاہ سے ڈرائنگ روم تک اور ڈرائنگ روم سے کھڑکی کے باہر لے آیا۔

لوگوں نے چلا کر کہا "راجکاری مارا راجکاری"۔

نریندر راجکاری کو ہاتھوں میں اٹھائے آگے بڑھ رہا تھا۔

مجمع سے آوازیں بلند ہوئیں۔

"ہائے ہائے مر گئی"۔

"مری نہیں زندہ ہے۔"

"بے چاری بے ہوش ہو گئی ہے۔"

"نہیں جی مر گئی ہے۔"

"ابے تو میں کہتا ہوں نہیں مری ہے۔"

نریندر نے کہا۔ "کھڑے کھڑے منہ کیا تک رہے ہو۔ اس غریب ایڈی کانگ کی لاش کو تو نکالو۔ اندر شاید کوئی خادمہ بھی ہو گی۔ اسے بھی دیکھو۔"

دو تین تنومند آدمیوں نے ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا پھر بہت سے لوگ کھڑکیوں سے اندر کی طرف پل پڑے۔ کسی کو بچانے کا جذبہ کم تھا۔ لوٹنے کا جذبہ زیادہ تھا۔ تھوڑی دیر میں لوگوں نے سیلون کا دروازہ بھی کھول دیا اور اچھی قیمتی چیزیں نکال کر باہر لانے لگے۔ کسی نے نریندر کی طرف توجہ نہیں کی۔ نریندر راجکماری کو اٹھائے پہاڑی سے نیچے اتر گیا۔ سامنے ریت تھی چھوٹے چھوٹے سنگلاخی ٹیلے ان سے آگے ایک اونچے ٹیلے پر نیم کا درخت تھا۔ اس سے آگے بے برگ و گیاہ پہاڑی پر سنگِ مرمر کی چٹانیں چمک رہی تھیں۔ ان کی چوٹی پر سنگ کی ایک راجپوتی چوپر بھی چمک رہی تھی۔ نریندر نے راج کماری کو نیم کے درخت کے نیچے لٹا دیا۔ اور اس کے ہاتھ زور زور سے ملنے لگا۔ راجکماری ہوش میں نہ آئی۔ اس کے گال سفید اور مسنے ہوئے تھے اور ہونٹوں کا رنگ گویا کسی نے چوس لیا تھا۔

نریندر نے ادھر ادھر دیکھا۔ کاش اس وقت کہیں سے پانی مل جاتا مگر پانی کہیں نہ تھا۔ چاروں طرف ریت تھی۔ اور خاک بگولوں کی صورت اڑ رہی تھی۔ اور نیم کے زرد زرد کھڑکھڑاتے ہوئے پتوں کو اپنے دامن میں بھر کر گاڑی کی طرف لے جا رہی تھی۔ یکایک

نریندر کو ایک خیال آیا۔ اور اس کے آتے ہی اس نے راجکماری کے گال پر زور سے ایک طمانچہ رسید کیا۔

راج کماری ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ اور اپنا گال سہلانے لگی۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے نریندر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم نے میرے طمانچہ مارا؟"

"ہاں۔"

"تم بڑے بدتمیز ہو۔"

"بدتمیزی تو تھی" نریندر نے مسکرا کر کہا۔ "مگر تمہیں ہوش میں لانے کا کوئی اور طریقہ بھی نہ تھا۔"

راجکماری کو نریندر کی مسکراہٹ بھی کھل گئی۔ اسے اس ہنستے ہوئے نوجوان پر بڑا غصہ آیا۔ جس کی قمیض پھٹی ہوئی تھی۔ جس کی آنکھوں میں ایک عجیب بیباکی کی چمک تھی۔ اس نے ٹھوکر سے ریت اڑاتے ہوئے کہا۔ "جاہل، بدمعاش، بدتمیز، تم نہیں جانتے تم نے کس کو طمانچہ مارا ہے۔ میں راجکماری ہوں راج کماری۔ دور ہو جاؤ میرے سامنے سے۔"

نریندر اپنی جگہ سے اٹھا۔ مسکراتے ہوئے۔ اسے بالکل کوئی مایوسی نہیں ہوئی۔ ریت کے کچھ ذرے راجکماری کی ٹھوکر سے اڑ کر اس کی آنکھوں میں گر پڑے۔ وہ اپنی آنکھیں ملتا ہوا نیم کے درخت کے نیچے سے اٹھا اور راجکماری کی طرف دیکھتے ہوئے ٹہلتا ہوا گاڑی کی طرف چلا گیا۔ راجکماری اپنا گال سہلانے لگی پھر غصے سے اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔ اسے سچ مچ ایسے وحشی آدمی پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ اس کمبخت کی انگلیوں کے سرخ نشان ابھی تک اس کے گال پر تھے۔

ساتواں باب

پٹڑی کے قریب دو آدمی فائرمین کی لاش اٹھائے چلے آرہے تھے۔ ان کے ساتھ گارڈ سر جھکائے چل رہا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے چند اور لوگ بھی چل رہے تھے۔

نریندر نے پوچھا "ڈرائیور کا کیا ہوا؟"

گارڈ نے کہا "ایک ہی جھٹکے سے اس کا جسم جلتے ہوئے بوائلر کے اندر چلا گیا"

نریندر چپ ہو گیا اور گارڈ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد نریندر نے پوچھا کتنے مرے؟"

گارڈ نے کہا "ابھی سات آدمیوں کی لاشیں ملی ہیں۔ ہم لوگ انہیں آخری ڈبہ میں اکٹھا کر رہے ہیں۔ کیا تمہارا بھی کوئی عزیز کھو گیا ہے؟"

نریندر کو غلام رسول کا خیال آیا۔ اس نے آہستہ سے کہا "ہاں"

گارڈ نے کہا۔ "چل کر لاشوں میں دیکھ لو۔ شاید۔۔۔۔"

آخری ڈبے کے باہر دوسری لاشوں کے ساتھ اس یورپین کی لاش بھی پڑی تھی جسے نربندر نے ایرکنڈیشنڈ ڈبے میں دیکھا تھا جہاں اس کی بیوی اس سے طلاق مانگ رہی تھی۔ اس یورپین کے ماتھے پر کنپٹی کے پاس ایک گہرا سوراخ کا نشان تھا جیسے حادثہ ہوا تھا۔ یورپین اپنی جھگڑالو بیوی کی باتوں سے تنگ آکر اوپر کی سیٹ پر سو گیا تھا۔ حادثے کے جھٹکے سے اس کا جسم زور سے اچھل کر نیچے گرا۔ اور سامنے کی دیوار پر لٹکے ہوئے آہنی ہکوں سے ٹکرایا۔ جو دیوے کمپنی نے کپڑے ٹانگنے کے لیے لگا رکھے تھے۔ دوسرے لمحہ کوٹ ٹانگنے کا ہک اس کی کنپٹی کے اندر گہرا چلا گیا۔ موت فوری واقع ہوئی تھی۔ یورپین کی بیوی اس کا سر اپنی ران پر رکھے رو رہی تھی۔

"اوئیک۔ اوئیک۔ میں تم سے محبت کرتی تھی۔ اوئیک میں تم سے طلاق نہیں چاہتی تھی۔ نیک سنو میرے پیٹ میں تمہارا بچہ ہے۔ میک سنو۔۔۔۔۔"

لیکن نیک بہت دور چلا گیا تھا۔ سکاٹ لینڈ کی گلپوش پہاڑیوں کا انسان آج راجپوتانے کے ریگستان میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ طلاق۔ محبت۔ موت۔

"اور نیک۔۔۔۔ او۔۔۔۔ نیک۔ صرف ایک لفظ سن لو۔۔۔۔"

مائے موت سے پہلے کا وہ ایک لفظ جو منہ سے کبھی باہر نہیں آتا۔ جو آنکھوں ہی آنکھوں میں بکھر کے رہ جاتا ہے۔ وہ موت کے سائے کی طرح پراسرار اور خاموش لفظ جو بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جس کے سیاہ پردوں کے اندر زندگی کے کتنے ہی اسرار و رموز الفت کے کتنے ہی سربستہ راز۔ چاہت کی کتنی ہی حسرت ناک داستانیں مستور ہوتی ہیں۔ موت کیوں یہ آخری لفظ سننے نہیں دیتی۔ کیوں وہ کانوں کو بہرہ کر دیتی ہے۔ اور آنکھوں کی پتلیوں کو۔

خشک کر دیتی ہے۔ اور کیوں وہ دل کے دروازے چاروں طرف سے بند کر دیتی ہے۔
تاکہ دل کے کسی کونے سے محبت کا نام پیام نہ آئے۔ جو جانے والی روح کو موت
کی پہنائیوں میں بھی زندگی کا پیام دیتا ہے۔
اس نہ کہنے والے آخری لفظ کی حسرت کس نے دیکھی ہے۔ اور جانے والے
شاید اگر تو دیکھ لے تو شاید موت پر بھی ٹوٹ جائیں۔ اور تو ان آخری برفیلی وادیوں
سے گزر کر واپس اپنے محبوب کی آغوش میں آ جائے۔
مگر کوئی نہیں آتا۔ ان برفیلی وادیوں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ کیونکہ موت زندگی
کے ختم ہونے کا نام نہیں ہے۔ وہ بس ایک آخری لفظ نہ سننے کا نام ہے۔
"ٹھیک ٹھیک"
ایک لفظ۔
ایک نامکمل تشنۂ تکلم آواز جو اگر کبھی انسان کے سینے سے پھوٹ پڑی تو صورِ
اسرافیل کی طرح موت کی وادیوں میں گونجے گی اور جہاں مردے پڑے ہوں گے۔
وہ انسان کی عظمت، جبروت، شوکت اور سطوت کی زندگی پا کر بہار آخرید ہ
کلیوں کی طرح اٹھ کھڑے ہوں گے۔

ایک سندھی لڑکا مرا پڑا تھا۔
اس کی عمر مشکل سے گیارہ بارہ برس ہو گی۔ وہ بےحد میلے کچیلے کپڑے پہنے

ہوئے تھا۔ اس کی پھٹی ہوئی قمیض سے چند آنے باہر نکلے آئے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ میں ابھی تک ٹین کا ایک ادھ کھلا ڈبہ تھامے ہوئے تھا جس میں سے سرخ سفید، سبز اور نارنجی رنگ کی گولیاں جھانک رہی تھیں۔ ایک آنے کی بارہ کھٹی میٹھی گولیاں مسافر ان گولیوں کو بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ اسٹیشنوں کے درمیان لمبے لمبے وقفوں میں ان گولیوں کو منہ میں ڈال کر اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ اس کے قریب ایک چھوٹا سا لڑکا کوئی آٹھ نو برس کا رو رہا تھا۔

"چونی .... چونی ...."

"چونی تمہارا بھائی تھا؟" نریندر نے پوچھا۔

"ہاں!"

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"کراچی کے"

"یہاں کہاں رہتے ہو؟"

"کہیں نہیں۔ اسی گاڑی میں رہتے ہیں۔ اور گولیاں بیچتے ہیں۔"

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"کہیں نہیں .... چونی .... او چونی .... سائیں اٹھ نا"

چونی سائیں کیا تم اس سندھی قوم کی اولاد ہو جو موٹروں میں گھومتی ہے۔ شارک سکن کے سوٹ پہنتی ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتی ہے۔ نہیں چونی۔ تم تو

مجھے کسی دوسری قوم کی اولاد معلوم ہوتے ہو۔ کبھی میٹھی گولیاں بیچنے والے بچے پھٹے چیتھڑوں میں گھومنے والے آوارہ معصوم تو نے کبھی ماں کی لوری نہیں سنی۔ صرف انجن کی گھر گھر سنی ہے۔ تجھے کبھی گھر کا بستر نہیں ملا۔ صرف پلیٹ فارم کا پتھر ملا۔ تو نے کبھی وہ خوبصورت تصویروں والی کتاب نہیں دیکھی جس میں ننھی ننھی بچیاں عمدہ فراک پہنے اور خوبصورت لڑکے بہترین کارڈ ورائے کی نیلی نیکریں پہنے حسین پریوں کی کہانیاں سنتے ہیں۔

اٹھ چونی دیکھ اسکول میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ اور پیارے پیارے لباس پہنے ہوئے پیارے پیارے بچے کتابیں بغل میں دبائے اپنے گھروں کو بھاگ رہے ہیں۔

جہاں منگورانی کا باپ اور اڈورانی کی ماں اور بھوجوان کی بڑی بہن اپنے خوبصورت گھروں کے دروازے کھولے ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ کیتلی میں چائے ابل رہی ہے۔ اور میز پر آم کے پتوں کے کاڑھے ہوئے میز پوش پر چمکتی ہوئی طشتریوں میں نارنگیاں سیب انگور ٹافیاں۔ کیک اور چاکلیٹ رکھے ہیں۔ اور تو اپنے پھٹے چیتھڑوں میں یہاں مردہ پڑا ہے۔ کیا اس ساری خوبصورتی اور سارے حسن کا ایک ذرہ بھی تیرے لئے نہیں تھا۔ کیا تیرے لیے صرف یہی تھا کہ تو ایک سٹیشن سے دوسرے سٹیشن اور ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے تک گھوم کر قانون کی زد سے بچ کر کھٹی میٹھی گولیاں بیچتا پھرے اور ایک اس ظالم گاڑی کی پٹڑی کے نیچے کچلا جائے۔ چونی پھر اس زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اس موت کا مطلب کیا ہے۔ ا چونی کیا تو سچ مچ اس امیر سندھی قوم سے ہے یا اس دوسری قوم سے جو ہر قوم میں سندھی، پنجابی، بنگالی، مراٹھی۔ انگریزی پرتگالی، چینی قوم کے اندر ایک دوسری اور بالکل اجنبی قوم کی طرح رہتی ہے۔ قوم کے اندر ایک اور قوم۔ جام کے اندر درد تہہ جام۔۔۔۔

"چونی! ... او چونی ... "

چونی کا بھائی رو رہا تھا۔

گارڈ نے چونی کی جیب کے گیارہ آنے نو پائی اٹھائے ... چھوٹے بچے کی جیب میں ڈال دیئے۔ اور کھٹی میٹھی گولیوں والا ڈبہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور پلٹ کر دوسری لاشوں کی طرف دیکھنے لگا۔

یہ ایک نوبیاہتا لڑکی کی لاش تھی۔ اس کے سانولے ہاتھ پر ابھی تک سرخ مہندی موجود تھا۔ اور سرخ آنچل تھا اور مہندی لگے ہاتھوں میں ہاتھی دانت کی سرخ چوڑیاں اور چاندی کے کلیرے تھے۔ اور چہرے پر ابھی تک معصوم حجاب تھا۔ اس کا دولہا اس کے قریب کھڑا سسک رہا تھا۔ دولہا کا باپ دھوتی پہنے اور گلابی پگڑی باندھے اسے سمجھا رہا تھا۔

"ارے کیوں مرا جاتا ہے۔ مر گئی تو کیا ہوا۔ دوسرے مہینے میں تیری دوسری جگہ شادی کر دوں گا۔ لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔"

لڑکی۔ یعنی بھیڑ یعنی بکری۔ شادی۔ یعنی بوچڑ خانہ۔ سہاگ یعنی کرائے کا گوشت!

پھر شہنائی کیوں بجتی ہے۔ پھر عورتیں سہاگ گیت کیوں گاتی ہیں۔ پھر دلہن آرسی میں اپنی صورت کیوں دیکھتی ہے۔ پھر یہ لوگ محبت کا کھیل کیوں کھیلتے ہیں؟

کیوں وہ اس بکری کے گلے میں ایک رسی نہیں ڈال دیتے۔ اور اسے گھر سے باہر نکال کر بوچڑ کے ہاتھ میں نہیں دے دیتے۔

لڑکے کے باپ نے گارڈ سے کہا "یہ سارا زیور جو اس دلہن نے پہن رکھا ہے ہمارا ہے۔"

گارڈ نے کہا۔ پولیس اس کی فہرست تیار کرے گی۔ یہ زیور پولیس کی تحویل میں رہے گا۔ عدالت سے مل جائے گا۔"

"مگر تم نے اس لڑکے کو گیارہ آنے نو پائی دے دیئے"

"تم اپنا مقابلہ اس گولیاں بیچنے والے یتیم بچے سے کر رہے ہیں شرم نہیں آتی؟" گارڈ نے جل کر کہا۔ اگر تمہیں گیارہ آنے نو پائی چاہئیں۔ تو میں اپنی جیب سے دیئے دیتا ہوں۔"

دولہا اپنے باپ کو پرے لے گیا۔

نریندر بڑے غور سے اس لالچی آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو مردہ دلہن کے جسم سے ابھی ابھی سارے زیور نوچ لینا چاہتا تھا۔ یکایک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ نریندر نے گھوم کر دیکھا تو خوشی سے چلایا۔

"غلام رسول ــــ"

غلام رسول نے کہا "میں تمہاری لاش کو یہاں دیکھنے آیا تھا۔"

نریندر نے کہا اور میں بھی تمہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح بغلگیر ہوئے جیسے مدتوں سے بچھڑے مست گلے مل رہے ہوں۔ لاشوں کی طرف پیٹھ کئے کھڑے اور چپکے ایک دوسرے

سے باتیں کر رہے تھے۔

کھنہ کہہ رہا تھا۔ "یار چھگن اپنی سنیچر کی ریس گئی۔"

چھگن بولا۔ "ٹپ تو اب کے مجھے بھی بہت اچھے ملے تھے۔ مگر اس کم بخت ایکسی ڈنٹ نے ....."

کھنہ نے بات پوری کی "کو نڈا کر دیا۔"

گارڈ کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھ کر دونوں اس سے مخاطب ہو گئے۔

ریلیف ٹرین کب آئیگی گارڈ صاحب؟

"کچھ نہیں کہہ سکتا" گارڈ بولا پیچھے ماجوہ اسٹیشن رہ گیا ہے یہاں سے چالیس میل پیچھے۔ آگے پچھتر میل پر دربار واڑہ ہے۔ ابھی تین چار گھنٹے تو فکر نہیں کریں گے۔ پھر تار دیں گے۔ ٹیلیفون پر پوچھیں گے۔ ماجوہ والے کہیں گے ٹرین پار ڈسے نکل گئی ہے۔ دربار واڑہ والے بولیں گے ٹرین یہاں نہیں پہنچی۔ پھر وہ ایک گھنٹہ راہ دیکھیں گے۔ تب تک رات ہو جائے گی۔ پھر کسی واچ مین کی پارٹی کو یہاں پیدل بھیجیں گے۔ کیونکہ ٹرالی دونوں سٹیشنوں پر نہیں ہے۔ بہت جلدی کام ہوا تو بھی آدمی کل صبح تک یہاں پہنچیں گے۔ پھر خبر لے کر واپس جائیں گے۔ پھر اسٹیشن سے تار کھڑکائیں گے۔ ادھم پور جنکشن پر اگر ریلیف ٹرین کا بندوبست ہو سکا تو ٹھیک ہے ورنہ وہ لوگ دوسرے جنکشنوں پر ٹیلی فون کریں گے۔

کھنہ بولا "لو اتوار کی ریس بھی گئی۔"

گارڈ کہہ رہا تھا۔ پھر جس جنکشن سے انجن اور ڈبے فالتو ملے وہاں سے ٹرین

رڈمیں باندھیں گے پھر ریلیف ٹرین چلے گی۔ پھر یہاں پہنچے گی۔"

جھگن نے گھبرا کر کہا۔ "تم انوار کو رو رہے ہو میں سمجھتا ہوں بدھ کی ریس بھی گئی۔"

"ریس گئی" گارڈ خفا ہو کے بولا۔ "ارے سیٹھ صاحب شکر کرو ریس گئی زندگی نہیں

ورنہ تم بھی وہاں پڑے ہوتے" گارڈ نے لاشوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے

۔ اور آگے بڑھ گیا۔

کھنہ تو کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ اس شرمندگی کو چھپانے کے لئے اس نے جلدی سے

یک اینڈ ٹیک سوٹ سے خیالی دھول اڑائی۔ پھر جیب سے رومال نکال کر اسے اپنی ناک

رکھ کر کہا۔ "سالا بڑا گستاخ ہے۔ اس کا نمبر نوٹ کر کے رکھو جھگن۔ میں مسٹر دھون کو جانتا

ں وہ ریلوے میں ایس۔ ٹی۔ یو۔ دی ہیں۔ سالے کا کونڈا کر وا دوں گا۔ یہ طوطا

پنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔"

جھگن نے کہا۔ "میں مسٹر نندی کو جانتا ہوں۔ وہ دھون سے بڑے افسر ہیں۔

رے دھون تو نمالی۔ ٹی۔ پو۔ دی ہیں۔ مگر وہ تو ڈبلیو۔ ایکس۔ وائی ہیں۔ ان کا

لفظا اسے ڈسمس کرنے کے لیے کافی ہے"

کھنہ نے بات کا رخ پلٹ کر کہا "چلو یہاں سے چلیں ادھر کشل اور اما

ن ہو رہی ہو گی۔

جھگن چلتے چلتے وہیں کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "کھنہ

بازو میں بازو ڈال کے بولا۔ کھنہ ذرا سوچو تو ایک رخ یہ بھی ہے اس نقویہ کا کشل

راما ہمارے ساتھ نہیں ذرا حساب لگا کے سوچو یہ حادثہ کتنا رومانٹک ہوا جاتا ہے یعنی

اور اما یہ کھلی زمین اور یہ کھلا آسمان تم اور میں اور کوئی نہیں تاڑیں بابا کی سوگند

مجھے تو یہ حادثہ بہت ہی دلچسپ معلوم ہوا ہے۔"

کھنہ نے کہا "سالے ہمارے دوستوں کی بیویاں ہیں"

"تو کیا ہوا۔ ان کو موقع ملتا تو کیا کرتے۔ ارے اس دن میں کرکٹ کلب اپنی بیوی کوامالہ کے شوہر گوتم کے پاس آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اسی کی پر۔ بعد میں میری بیوی گوتم کی شکایت کرتی تھی" چھگن نے کھنہ کے بازو میں چٹکی لی

کھنہ نے کہا "مگر امانت میں خیانت بری بات ہے"

"پھر وہی بات ارے تم سے کہہ چکا ہوں۔ ہم تو بزنس مین ہیں۔ دن کو امانت رات کو خیانت کرتے ہیں۔ پھر اس امانت میں کتنی بار خیانت ہو چکی ہے یہ سوچو" چھگن نے اپنے پیلے دانت نکالے اور کھنہ کو کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا۔

نریندر آگے چلا گیا۔ کوئی بیس قدم چلا ہوگا کہ ایک جگہ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر رک گیا۔ بھیڑ کے بیچ میں اسے ڈاکٹر کامتھ کا پریشان چہرہ نظر آیا۔ ڈاکٹر کامتھ ماتھے پسینے کو پونچھتا ہوا لوگوں سے چلا کر کہہ رہا تھا۔

"پرے ہٹ جاؤ۔ پرے ہٹ جاؤ۔ بھگوان کے لیے ہوا آنے دو"

"کیا ہوا۔ کیا ہوا؟" نریندر نے اپنے قریب کے ایک آدمی سے پوچھا۔

"ایک فقیرنی بچہ جن رہی ہے" اس آدمی نے بڑی دلچسپی سے جواب دیا۔

نریندر بھیڑ میں گھس کے آگے بڑھ گیا۔

"ڈاکٹر کامتھ نے غصہ سے چلا کر کہا "تم لوگوں کو شرم نہیں آتی کیا دیکھ رہے ہو۔ پرے ہٹ جاؤ۔"

نریندر بھیڑ میں آگے بڑھ گیا۔

ایک فقیرنی فرشِ خاک پر پڑی دردِ زہ سے چلا رہی تھی۔ اس کے پھٹے چیتھڑوں ہی سے اس کا ابھرا ہوا پیٹ درد اور کرب کی اذیت ناک لہروں پہ ڈول رہا تھا۔ سمندر اور ساحل کی لڑائی تھی۔ موت اور زندگی کی کشمکش تھی۔ فقیرنی اپنے کھلے بالوں کی ایک موٹی سی لٹ اپنے منہ میں دبائے دانت بھینچے درد اور موت کا خنجر کی طرح چبھنے والی اذیت کا مقابلہ کر رہی تھی۔

اور لوگ بڑی دلچسپی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

نریندر نے اپنی آستین چڑھا لیں۔ اور مکا دکھاتے ہوئے کہا۔ ماں بہنوں والے ہو تو پیچھے ہٹ جاؤ نہیں تو ۔ ۔ ۔" نریندر آگے بڑھا لوگ بڑبڑاتے تھوڑا تھوڑا سا پیچھے بھی ہٹے۔ مگر بالکل دور نہیں گئے۔ ذرا پرے ہو کر تماشہ دیکھنے لگے ڈاکٹر نے ناامیدی سے سر ہلا دیا۔ اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ ریت کے فرش پہ نہیں ہے ہسپتال کے کسی کمرہ میں ہے۔ جہاں اس کے طالب علم چاروں طرف کھڑے ہیں۔ اور وہ آپریشن کر رہا ہے۔

ایک آدمی نے سرگوشی میں کہا "ادھیڑ عمر کی فقیرنی ہے بھلا اسے اس عمر میں کیا سوجھی"

"اس کا باپ کون ہو گا" دوسرے نے پوچھا۔

"ہو گا کوئی ہم تم میں سے ایک" ایک منچلا آدمی مسکرا کر بولا۔ اور بہت سے لوگ ہنس پڑے۔

ڈاکٹر کا ہاتھ بدستور اپنے کام میں مشغول رہا لیکن ذہن [illegible] ڈگمگا کے چیخ رہی تھی کیسی عجیب بات تھی۔ ایک [illegible] ہاں بھی جس نے پسینہ پسینہ کر کے [illegible] ہلا لگا کے اپنی ذات کی اپنی نیم گرم کوکھ میں ابھرتی ہوئی زندگی کی حفاظت کی تھی [illegible] سے کیا

تاریک راتوں میں کسی دکان کی سیڑھی کے نیچے دبک کر اسے اپنے روح کی گرمی پہنچائی تھی اسے اپنی بھوک سے بلکتی ہوئی شریانوں کا خون دیا تھا۔ ایک بچہ تھا فٹ پاتھ کا سپنا جسے اس سماج نے اس کی پیدائش سے پہلے ہی بھکاری بنا دیا تھا۔ کیا اس بچے نے اپنی ماں کے ساتھ نہیں مانگی تھی۔ گلی کوچوں میں روٹی کے ایک ٹکڑے کیلئے صدا نہیں لگائی تھی۔ کیا اس اپنی ماں کیساتھ فاقے نہیں کئے تھے۔ جاڑوں کی یخ بستہ سردی نہیں کھائی تھی۔ پھر بھی یہ بچہ زندہ رہنے پر بضد تھا۔ اپنی ماں کیلئے لڑ رہا تھا۔ اپنے مستقبل کیلئے اس ڈوبتے ہوئے پیٹ کے اندر اس کی کشمکش اور لڑائی صاف نظر آتی تھی۔ جیسے کوئی تیراک بھنور میں پھنس جائے۔ اور ادھر ادھر سے لڑتا ہوا سمندر سے باہر آنے کی کوشش کرے۔

نریندر بالکل مبہوت ہو کر دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر نے نریندر سے کہا منہ پرے کر لو۔

نریندر پلٹ گیا بہت سے لوگ بھی پیٹھ موڑ کے کھڑے ہو گئے مگر اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چیخ سنائی دی بچے کی پہلی چیخ وہ مسرت اور فتح میں ڈوبی ہوئی زندگی کی پہلی آواز جیسے ٹھٹھری ہوئی سحر میں سورج کی پہلی کرن۔ نور آسمان پر پہلے ستارے کا نزول جیسے ناامید شاخ پر شگوفے کا پہلا تبسم۔ وہ آواز گویا کہہ رہی تھی۔ میں ہوں۔ میں ہوں۔ فرشتو جھک جاؤ۔ مندرو آرتی اتارو۔ مسجدو اذان دو گرجاؤ! کنول کے پھول کی طرح کھلی ہوئی گھنٹیاں بجاؤ۔ میں ہوں میں آ گیا ہوں۔ انسان کا بیٹا۔ آج میں نے تاریکی کا جگر چاک کیا ہے۔ اور دوزخ کا سینہ چیرا ہے۔ اور موت پہ فتح پائی ہے آج میں ننگے بدن آیا ہوں خاک و خون میں لتھڑا ہوا مگر ایک جری سپاہی۔ حیات کا علم اٹھائے ہوئے کامران و فتح یاب آیا ہوں۔ میرے جلو میں ہواؤں کی خوشبو

شفق کا اطلس و کمخواب ہے اور حیات کی زمزمہ ریزی ہے اٹھو طاؤس دوف، چنگ و رباب بجاؤ اور زندگی کو سلام کرو کیونکہ موت صرف ایک حادثہ ہے وہ تسلسل نہیں ہے وہ ایک بھنور ہے ساحل نہیں ہے۔ ایک وقفہ ہے منزل نہیں ہے۔۔۔۔

ڈاکٹر کے ہاتھ میں وہ ننھا بچہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں ہلا کر چیخ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مسرور نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا پھر اس نے بچے کو بڑی احتیاط سے فقیرنی کے قریب ریت پر لٹا دیا۔

فقیرنی نے بچے کو اپنے چیتھڑوں میں لپیٹا لیا۔ یکایک اس کے چہرے سے درد اور اضطراب کی ساری لہریں غائب ہو گئیں۔ یکایک سمندر نے ساحل کو چوم لیا۔ اور سمندر کو قرار آ گیا۔ اب فقیرنی کے چہرے پر ایک عجیب و غریب ماتا سے معمور درد اور گداز سے بھری ہوئی روشنی آ گئی۔ اور نریندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کوئی فقیرنی نہیں ہے یہ تو مریم ہے یہ بچہ کوئی معمولی بچہ نہیں ہے یہ تو مسیح ہے اور بدھ ہے اور خود بھگوان ہے۔ اور پہاڑوں زمینوں اور آسمانوں پر حکومت کرنے والا شاعر ہے۔ نریندر کے کانوں میں ایک کسی آواز نے سنائی دی اس نے دیکھا ایک بڈھا مسرت اور خوشی سے رو رہا تھا۔ اور ایک اور آدمی اپنے آپ سے کہہ رہا تھا "کہیں سے اس بچے کیلئے فراک کا بندوبست کرنا چاہیئے۔"

فقیرنی کے نحیف اور کمزور آواز میں اپنی گٹھڑی کھولنے کیلئے کہا۔ جب ڈاکٹر جلدی سے گٹھڑی کو کھولا تو اس میں سے ایک ننھا سا فراک نکلا ایک نیلا ٹکڑا تھا۔ پیلا ٹکڑا تھا۔ ایک سرخ ٹکڑا تھا۔ ایک ہرا ٹکڑا ایک نارنجی ٹکڑا تھا۔ یہ فراک جو کہ آستین کسی کی قمیض کسی کا کوٹ تھا۔ جو کبھی کسی کی ساری، کسی کا بلاؤز رہ چکا تھا

جو شاید کبھی کسی کا ریشمی رومال تھا - آج اس ننھے بدن پر انسان کے معزز جھنڈے کی طرح چمک رہا تھا - فقیرنی نے بڑی حیران نگاہوں سے اپنے بچے کی طرف دیکھا پھر اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا - اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا حیا آ گئی - اور اس نے لوگوں کی طرف دیکھ کر اس طرح اپنی نظریں جھکا لیں گویا اپنے گھر میں اپنے رشتے داروں سے کہہ رہی ہو تم سب نے میرا بچہ دیکھ لیا ہے - اب تم یہاں سے چلے جاؤ - اور مجھے میرے بچے کو اکیلا چھوڑ دو - جیسے سب نے اس کی بات سمجھ لی ہو - آہستہ آہستہ مجمع ہٹنے لگا - آہستہ سب لوگ سر جھکائے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے چپ چاپ رخصت ہو گئے - ان کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا - گویا - آج انہوں نے کوئی معجزہ دیکھا ہے تب نریندر بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا - اب اس کے دل میں ایک عجیب طرح کا اطمینان تھا - اور شادمانی تھی - اور وہ کچھ کہنا چاہتا تھا - اپنے لیے کسی کیلئے - سب کے لیے - یکایک اس کے ہاتھ پاؤں کچھ کرنے کے لیے بیقرار ہو گئے اس نے سامنے سے گارڈ کو جاتا ہوا دیکھا - اور وہ بھاگ کر اس کی طرف چلا گیا -

---

آٹھواں باب

نریندر نے گارڈ کو پکڑ کر کہا: "گارڈ صاحب آپ کسی آدمی کو قریب کے اسٹیشن پر کیوں نہیں بھیجتے۔ وہاں سے کسی آدمی کے آنے کا انتظار کیوں کرتے ہیں"

گارڈ نے کہا: "کس کو بھیجوں! یہاں ہر شخص نفسی نفسی کے عالم میں ہے ریلوے کے دو سپاہی بھی زخمی پڑے ہیں"

نریندر نے غلام رسول کی طرف دیکھا۔ غلام رسول نے نریندر کی طرف دیکھ کے "میں تمہیں چھوڑ کے کہاں جا سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں جا سکتے" گارڈ نے پوچھا"

غلام رسول نے نریندر کی طرف اشارہ کر کے کہا: "مجرم ہے"

گارڈ نے کہا: "تو یہاں سے بھاگ کر کہاں جاتے چاروں طرف تو ریت ہی ریت

ہے۔میلوں تک کوئی آبادی نہیں۔"

نریندر نے کہا" میں وعدہ کرتا ہوں میں نہیں بھاگوں گا۔"

غلام رسول نے کہا۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تم نے کوئی گڑبڑ کی تو میری پنشن ماری جائے گی۔ بال بچے والا ہوں۔"

نریندر نے غلام رسول کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا۔" قانون کا مجرم ضرور ہوں غلام رسول دل کا مجرم نہیں ہوں۔ تم اطمینان سے جا سکتے ہو۔"

" تو لاؤ چھٹی۔" غلام رسول نے گارڈ سے کہا۔

گارڈ نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور جلدی جلدی چھٹی لکھنے لگا۔

گارڈ چھٹی لکھ رہا تھا۔ نریندر اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ کہ ایک آدمی نے آکر اس سے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"یہاں کتنا عرصہ رکنا پڑے گا؟"

گارڈ نے پہلے تو غصے سے سر اٹھا کے دیکھا۔ اور جب دیکھا کہ کہنے والا کون ہے تو جھٹ سے مودب کھڑا ہو گیا۔ نریندر نے دیکھا، وہی ایئر کنڈیشنڈ ڈبے والا موٹا سیٹھ تھا۔ اس کے ساتھ ایک منیم تھا۔ وہ ذرا اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

گارڈ نے کہا" سیٹھ صاحب میں سمجھتا ہوں دو دن سے پہلے یہاں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں یوں کوشش کر رہا ہوں کہ جلدی سے جلدی ایک ہی دن میں ہو جائے مگر بڑی ایسی جگہ پھنسے ہیں۔ اور سنگل لائن ہے۔"

سیٹھ نے آہستہ سے سر ہلایا اور اپنے منیم کی طرف دیکھا پھر سیٹھ نے پوچھا۔

" بابوجی یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"کوئی چالیس میل دور"

"اور اگلا اسٹیشن؟"

"پچھتر میل"

سیٹھ نے اپنے منیم کی طرف دیکھا۔ دونوں بے حد سنجیدہ تھے۔ کتنی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے۔

گارڈ نے چٹھی ختم کر کے غلام رسول کو دی اور اس سے کہا "یہ باجوہ اسٹیشن ماسٹر کو دے دینا۔ سیدھے پٹڑی پٹڑی چلے جاؤ۔ کہیں صبح تک پہنچو گے۔ راستے کیلئے یہ بندوق بھی لیتے جاؤ۔ راستے میں جنگلی جانوروں کا خطرہ ہے"۔

گارڈ نے ریلوے سپاہی کی ایک بندوق بھی غلام رسول کے حوالے کر دی

سیٹھ نے گارڈ سے کہا میرا منیم بھی اس کے ساتھ چلا جائے تو کوئی حرج ہے!

"کیا حرج ہے۔ غلام رسول خوش ہو کے بولا۔ "ایک سے دو ہو جائیں گے راستہ آسانی سے کٹ جائے گا۔

"تو گردھاری تم چلے جاؤ اور واپسی میں اگر کوئی بیل گاڑی یا گھوڑا یا چھکڑا جو کچھ بھی مل جائے کر لینا۔

"جی بہت اچھا"

غلام رسول نے نریندر سے پوچھا "تو میں جاؤں؟" اس کے لہجے میں ابھی تک شبہ تھا۔

نریندر نے ہنس کر کہا۔ تم ایک چور کے وعدے پر اعتبار کر سکتے ہو۔ مگر ایک لکھ پتی کے وعدے پر نہیں۔"

کھلا پوشش نے قہر بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ گردھاری کو ایک طرف لے گیا اور اس سے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں۔ اور پھر جیب سے کچھ روپے نکال دیئے۔

نریندر بڑی دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اتنے میں لوہار کی بیوی پلاتی ہوئی آئی۔ وہ تو آ رہی تھی سیدھی گارڈ کی طرف لیکن نریندر اور غلام رسول کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ امید کی ایک ہلکی سی جھلک اسکی نم آلود آنکھوں میں پیدا ہو گئی۔ وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں تم تو میرے ڈبے کے آدمی ہو میرے بچائے ہوا سوقت میری مدد کرو گے۔ لوہار کی بیوی نے ملتجیانہ لہجے میں کہا "میرا شوہر ابھی تک ڈبے میں پھنسا ہوا ہے۔ کوئی اسے نکالتا نہیں اللہ کا واسطہ اسے بچالو۔۔۔

نریندر نے گارڈ کی طرف دیکھا۔ گارڈ نے آنکھیں جھکائے کہا۔ ڈبے کے اوپر ڈبہ چڑھا ہے بہت مشکل کام ہے۔ اور یہاں کوئی کسی کی نہیں سنتا"

سیٹھ منہ پھیر کے چلا گیا۔

نریندر نے لوہار کی بیوی سے کہا "چلو میں چلتا ہوں"

پھر اس نے غلام رسول سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ اطمینان رکھو میری بالکل فکر نہ کرو تم بس مدد لے کے آؤ"

"انشاء اللہ۔ غلام رسول نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ بندوق کاندھے پر ٹھیک رکھی اور گردھاری لعل سنیم کو لے کر چل دیا۔

نریندر لوہار کی بیوی کے ساتھ چل رہا تھا۔ لوہار کی بیوی آہستہ آہستہ روتی جاتی تھی۔ میرا تاج! ہائے میرا تاج!

"میرا صندوق۔ ہائے میرا صندوق کہاں ہے؟" ایک بڈھا اپنے نوجوان ساتھی سے پوچھ رہا تھا۔

"ذرا تیز چلو نا!" لوہار کی بیوی نے التجا اور غصے کے ملے جلے لہجے میں نریندر سے کہا۔

نریندر تیز تیز چلنے لگا۔

لوہار کی بیوی بھاگنے لگی۔

نریندر بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگا۔

اپنے ڈبے کے قریب جا کر اس نے دیکھا کہ ڈبے میں صرف لوہار ہی نہیں تین چار آدمی اور بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ کسی کا دھڑ نظر آ رہا ہے کسی کا بازو۔ کوئی صرف گردن تک آزاد ہے۔ تو کوئی بالکل دبا ہوا نظر آتا تھا چیخ رہا ہے۔ لوہار کا سر اور اس کے دونوں بازو بلبے کے باہر تھے۔ جو لوگ بلبے کے اندر تھے وہ چیخ ہی رہے تھے۔ مگر جو لوگ بلبے کے باہر تھے وہ لوگ انہیں دیکھ کر عجیب بے بسی سے رو رہے تھے۔ چاروں طرف ایک عجیب سی مجبوری، لاچاری اور معذوری کی بے بس فضا تھی۔ نریندر نے ادھر ادھر دیکھ کر لوگوں سے پوچھا۔

"کیا کسی کے پاس کلہاڑی ہے؟ کلہاڑی یا آری؟"

مگر اسے آس پاس کے کسی آدمی سے کلہاڑی یا آری نہیں ملی۔

نریندر ان لوگوں کو روتا چھوڑ کر دوسرے ڈبے کی طرف چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد

دو تین آدمیوں کو ساتھ لیا۔ اور انہیں لے کے نیم کے درخت کی طرف چلا گیا۔ جہاں راجکماری بیٹھی تھی۔ اس نے راجکماری سے کہا "یہاں سے اٹھو جاؤ"

راجکماری کو نریندر کا تحکمانہ لہجہ بہت ناگوار گزرا۔ اس نے جھک کر کہا "کیوں"

"ہمیں اس درخت کے تین بڑے ڈال چاہئیں" نریندر نے درخت کے اوپر چڑھتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں تو یہیں بیٹھوں گی۔"

نریندر نے راجکماری کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اور درخت سے دور لے جا کر ریت پہ پٹخ دیا۔

راجکماری غصے سے چیخنے لگی "بدمعاش میں تمہیں جیل میں بند کرا دوں گی۔"

نریندر مسکراتے ہوئے درخت کی طرف واپس آ گیا۔ اور ایک کلہاڑی لے کر پھر درخت پر چڑھ گیا۔ اس نے اور دو آدمیوں کو درخت پہ چڑھنے کو کہا۔ راجکماری غصے سے بھری ہوئی پھر درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گئی۔ اوپر شاخوں پہ کلہاڑی کی کھٹا کھٹ ہو رہی تھی۔

نریندر نے مسکرا کر کہا "تمہارے لیے کہتا ہوں کوئی ٹکڑا اڑ کر تمہاری آنکھ میں پڑ گیا تو کانی ہو جاؤ گی۔"

راجکماری نے سنا ان سنا کر دیا اور وہیں جمی بیٹھی رہی۔

لیکن جب اوپر سے ایک شاخ کے چرانے کی آواز آئی تو فوراً اٹھ کر بھاگی نریندر ہنسنے لگا۔ کلہاڑی کے ایک بھرپور وار سے اس نے شاخ نیچے گرا دی چند منٹوں میں نیم کی چار بڑی شاخیں زمین پہ گر پڑیں نریندر اور اس کے ساتھی ان پر ٹی

شاخوں کو اٹھانے لگے۔ اتنے میں چار آدمی خود بخود ان کی مدد کو آ گئے۔ اور ان سب آدمیوں نے مل کر ان سب شاخوں کو اٹھایا۔ اور ریل کے اس ڈبے کے پاس لے گئے۔ جس کے ملبے کے نیچے لوگ کراہ رہے تھے۔

یہاں پہنچ کر نریندر نے جلدی سے آدمیوں کو دو پارٹیوں میں تقسیم کیا ایک ملبے کے اس طرف دوسری پارٹی ملبے کے اس طرف لکڑی کے ڈنڈوں کو بیچ میں ڈال کر دونوں طرف سے لوگ ملبا اٹھانے لگے۔ ہائی ہو۔ ہیا ہو کی آوازیں گونجنے لگیں لوگوں کو کام کرنے میں مزہ آنے لگا۔ لوگ کام کرتے جاتے تھے کچھ لوگ آ کر صلاح دیتے جاتے تھے۔ پھر صلاح دینے والے بھی کام میں شریک ہو گئے۔ اب کم از کم ساٹھ ستر آدمی ملبا اٹھا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں لوہار اور پنڈت جی کی لڑکی اور دو اور آدمی ملبے سے نکال لیے گئے۔ ایک آدمی لپک کر ڈاکٹر کاستھ کو بلا لایا۔ زخمیوں کو طبی امداد دی جانے لگی۔ نریندر کی قمیض جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اور اس کے بائیں بازو سے خون بھی بہ رہا تھا۔

ڈاکٹر کاستھ نے کہا "لاؤ میں تمہاری بھی مرہم پٹی کر دوں"

نریندر نے ہنس کر کہا "نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں ٹھیک ہوں۔ پہلے آپ ان بیچاروں کی خبر لیجئے"

"ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!" ایک آدمی زور سے چلایا۔

ڈاکٹر نے پلٹ کر دیکھا۔ نریندر نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ یہ زخمی شاعر تھا۔ اس وقت اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اس کا کرتہ پھٹا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے ہاتھ میں ایک پنجرہ اٹھائے ہوئے بڑی بے چینی سے کہہ رہا تھا "ڈاکٹر صاحب دیکھئے"

میرے طوطے کو کیا ہو گیا ہے؟"

ڈاکٹر کا منتھ نے دیکھ کر کہا "تمہارا طوطا مر گیا ہے۔"

"مر گیا ہے؟" زخمی گھبرا کر بولا "نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب میرا طوطا نہیں مرا۔ وہ زندہ ہے۔ دیکھئے ڈاکٹر صاحب۔ پروں کے نیچے اس کا جسم ابھی تک گرم ہے ڈاکٹر صاحب مہربانی کر کے اسے کوئی انجکشن دیجیے۔ اس کی جان بچا لیجیے۔"

ڈاکٹر کا منہ نے غصے سے جھنجھلا کر کہا "یہاں اتنے آدمی مر رہے ہیں تمہیں اپنے طوطے کی پڑی ہے۔ شرم نہیں آتی چلے جاؤ میرے سامنے سے۔"

زخمی نے گڑگڑا کے کہا "نہیں ڈاکٹر صاحب اسے کسی طرح بچا دیجیے۔ اس طوطے میں تو میری جان ہے۔ یہ مر جائے گا۔ تو میں مر جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب آپ کو معلوم ہے۔ یہ میں نے اس کے لیے ڈھائی روپے کا پنجرہ بنوایا ہے۔ کس شوق سے کس محنت سے کس کس جتن سے میں اس کی خبر گیری کرتا ہوں ایک دفعہ یہ بیمار ہوا تو میں نے راتوں جاگ جاگ کر اس کا علاج کیا۔ ڈاکٹر ہر روز اسے دیکھنے کے لیے آتا تھا۔ ایک نرس اس کی تیمارداری کے لیے رکھی تھی آخر سبب مرض بہت بڑھا تو میں نے اسے ڈاکٹر کے ایل بل کے نرسنگ روم میں داخل کروا دیا۔ انڈر ٹریٹمنٹ۔ میرے پانچ روپے ضرور خرچ ہو گئے۔ مگر طوطا اچھا ہو گیا۔ ڈاکٹر بہت بھلا مانس ڈاکٹر تھا سبھی ڈاکٹر بھلے مانس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کے پاس دل ہے۔ آپ ایک شریف دل کی کیفیت سے ضرور واقف ہوں گے۔ میرے لیے طوطا سب کچھ ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں تو بچپن میں کسی چیز کو پیار نہیں کرتا صرف اس طوطے کو چاہتا ہوں۔ آپ اسے اچھا کر دیجیے۔ کسی طرح اچھا کر دیجیے۔ بڑا اچھا ہے بڑا سگا ... کیجیے ..

گا۔ کس خوش الحانی سے یہ آپ کو شدھ برج بھاشا میں کوتا سنائے گا۔ ڈاکٹر صاحب، ایسا طوطا سارے ہندوستان میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ گرنائی نسلی کا طوطا ہے جو طوطوں میں سب سے اونچی ذات ہے۔"

"چلے جاؤ!" ڈاکٹر کاستھ نے برافروختہ ہو کے زخمی سے کہا۔ "میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ میں انسانوں کو دیکھوں کہ تمہارے طوطے کو دیکھوں؟"

زخمی نے بڑی ملتجیانہ نگاہوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ مگر جب وہاں ڈاکٹر کے چہرے پر نرمی کی کوئی جھلک نہ دیکھی تو اپنا پنجرہ اٹھائے "ہائے میرا طوطا" کہتے ہوئے سر جھکائے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں وہ پنجرہ ابھی تک جھول رہا تھا۔

نریندر نے اپنی پھٹی قمیض سے اپنے بازو سے خون صاف کر دیا۔ اور پلٹ کر اگلے ڈبے کی طرف چلا۔

لوہار کی بیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "تم چور نہیں ہو تم اللہ والے ہو" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نریندر کو اپنے حلق میں کوئی چیز پھنسی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"اللہ چوروں کا بھی ہے۔ بہن"

نریندر آگے چلا گیا۔ لوہار کی بیوی نے تاج کا سر اپنی گود میں لے لیا اور اس کے رخساروں پہ محبت سے ہاتھ پھیر کے بولی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

لوہار کے لبوں پر ایک زرد سی مسکراہٹ آئی اس نے آہستہ سے کہا۔ "اب میں

اچھا ہو جاؤں گا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے اب تم بچ جاؤ گے "

لوہار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے رخساروں پر ٹپ ٹپ اس کی بیوی کے آنسو گر رہے تھے۔ اور وہ اپنے دل میں ایک عجیب سا سکون محسوس کر رہا تھا۔ جیسے زمین بارش کے قطروں سے سیراب ہوتی جاتی ہے۔ ان آنسوؤں کا ہر قطرہ اس کے لیے مرہم تھا۔

نریندر دوسرے گرے ہوئے ٹیلے میں سے بھی ملبے کے اٹھانے کے کام کو دیکھتا رہا۔ اب اسے خوشامد اور لجاجت سے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لوگ خود بخود اس کا حکم ماننے لگے تھے۔ اور بڑے جوش اور ولولے سے کام کر رہے تھے۔ کام کرتے کرتے کبھی اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے جب وہ سیدھا تن کر کھڑا ہوتا تو اسے سامنے نیم کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی راجکماری نظر آ جاتی۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا جیسے راجکماری اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ کبھی کبھی وہ جان بوجھ کر اسی موقعے پر پلٹ کے راجکماری کی طرف دیکھتا تو راجکماری گھبرا کر اپنی نظریں دوسری طرف کر لیتی۔ ایسے موقعوں پہ نریندر کے لبوں پہ ایک عجیب سی، کچھ تلخ سی، کچھ سوندھی سی۔ کچھ موہنی سی مسکراہٹ آ جاتی۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک جڑاؤ کنگن سا رقص کرنے لگتا۔ اور چاروں طرف سورج کے پنکھ سے پھیل جاتے۔ اور اس کا دل آہستہ آہستہ اندر ہی اندر گنگنانے لگتا۔

یکایک ایک آدمی نے آ کر اس سے کہا۔

نریندر، تمہیں ڈاکٹر کا منتھ بلا رہے ہیں۔"

نریندر بڑا خوش ہوا۔ اب لوگ اس کا نام بھی جان گئے تھے۔ وہ چور تھا۔ لیکن ۔۔

س حادثہ نے اسے عزت دی تھی۔ اور شہرت دی تھی۔ لوگ اس کی طرف پراحترام نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس نے کئی آنسوؤں بھری آنکھوں میں اپنے لئے شکر اجذبہ پایا تھا۔ اور کون اس جذبے سے خوش نہیں ہوتا۔ نریندر کا سینہ سرت سے معمور ہوگیا۔ اس نے کام کرنے والوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم کام تے جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔"

نواں باب

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔

سنگِ مرمر کی چٹانوں پہ ایک سنہرا نور بکھر گیا تھا۔ دور پہاڑوں پہ اکا دکا درخت کھڑے تھے۔ اور ریگستانوں سے لوٹتے ہوئے پرندے اپنے شفق گوں پر پھیلائے ہوئے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ ہوا میٹھی میٹھی سانس لیتی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ نرنیدر راجکماری کے پاس آکر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہولے سے کہا۔

"یہ شفق کس قدر خوبصورت ہے۔"

راجکماری چمک کر پلٹی اور نرنیدر کو دیکھ کر سہم گئی۔

نرنیدر راجکماری کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس نے زمین سے نیم کا ایک پتہ

اٹھا لیا۔ اور اسے دانتوں سے توڑ کر بولا "شفق اس لئے خوبصورت ہے کہ سورج ڈوب کر ابھرتا ہے۔ اگر سورج ڈوب کر کبھی نہ ابھرے تو پھر یہ خوبصورتی خوبصورتی معلوم نہ ہو۔ کیوں راجکماری؟"

راجکماری کچھ نہیں بولی۔

نریندر نے کہا۔ "تمہارا ایڈی کانگ تو بچ نہیں سکا بیچارہ۔ ہاں تمہاری باندی بچ جائے گی۔"

راجکماری مڑ کر دلچسپی سے سننے لگی۔

ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ لڑکی گو بری طرح زخمی ہے۔ مگر شاید بچ جائے بیچاری اپنی زندگی کے لیے بہت لڑ رہی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم راجکماری! غریب لوگ اپنی زندگی کے لیے کس قدر لڑتے ہیں۔"

راجکماری نے پھر منہ پھیر لیا۔

نریندر نے کہا۔ ڈاکٹر کا مطلب کہہ رہا تھا کہ اسے دو تین عورتوں کی سخت ضرورت ہے۔ جو نرسوں کا کام کر سکیں۔ تم جانتی ہو راجکماری۔ ڈاکٹر کی دوا میں شفا ہوتی ہے۔ لیکن عورت کے ہاتھ میں شفا ہوتی ہے۔ مریض کو اگر ڈاکٹر کی دوا میں بروقت ملے۔ اور عورت کا مسکراتا ہوا چہرہ ملے۔ تو اس کی بیماری آدھی رہ جاتی ہے۔"

راجکماری نے غصے سے کہا "میں نرس نہیں ہوں۔ راج کماری ہوں۔"

نریندر نے نیم کے پتے کو اپنی زبان پر رکھا۔ تھوڑا سا چکھا پھر آہستہ سے پتے کو تھوک دیا۔ "ہاں اس کا ذائقہ بڑا تلخ ہے!"

راجکماری نے شعلہ بار نگاہوں سے نریندر کی طرف دیکھا۔ مگر چپ کی چپ رہ گئی۔ کیونکہ نریندر اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ڈوبتے ہوئے سورج پر تھی۔ جو بڑے ٹیلے کے اوپر چمکتے ہوئے برج کے پیچھے جا رہا تھا اسوقت اس وقت صحرا کا ہر ذرہ کندن تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی ریت پہ ہوا کے سبکسار قدموں کے نشان تھے۔ شفق نے گاڑی کے ڈبوں کو بھی اپنے سنہری پردل میں چھپا لیا۔ لوگ دس دس بیس بیس کی ٹولیوں کی میں جگہ جگہ ریت کے ٹیلوں پہ جھاڑیوں میں یا کہیں درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ اب کہیں کہیں سے قہقہوں کی صدا بھی آنے لگی۔ تین چار لڑکے اور لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلنے لگے وہ لڑکے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دور نکل گئے۔ ان کی معصوم ہنسی کی گونج ایک بے نام خوشبو کی طرح ساری فضا کو مہکاتی گئی۔

"دیکھو راجکماری۔ دیکھو راجکماری لوگ موت کو بھول گئے ہیں" نریندر کہنے لگا۔ "وہ ابھی ابھی رو رہے تھے۔ اب وہ ہنس رہے ہیں ایک لمحے میں موت اپنے شہپر کھولے ہوئے آئی اور اس نے ایک عقاب کی طرح اس گاڑی کو اپنی دبوچ میں لے لیا۔ کسی کی گردن کٹی کسی کا بیٹا مرا۔ کسی کا سہاگ لٹا۔ لیکن زندگی پھر بھی باقی رہی دوسرے لمحے میں انسان پھر بھی ہنسا۔ کیونکہ انسان موت سے بھی بڑا ہے۔ کیوں کہ وہ زندگی کے سلسلے کو قائم رکھتا ہے۔ دیکھو راجکماری وہ لوگ صبح کا لایا ہوا کھانا کھا رہے ہیں۔ وہ لوگ تاش کھیل رہے ہیں۔ وہ عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ موت کی لاش ابھی ان کے درمیان ہے مگر زندگی کا سلسلہ ٹوٹا نہیں موت ایک

موڑ بے سود نہیں ہے۔ راجکماری چپ رہی۔

سورج غروب ہو گیا۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلنے لگا۔ لوگوں کے چہرے ایک دھندلے غبار میں چھپنے لگے۔ ہوتے ہوتے رات کی تاریک قبا زمین و آسمان کو اپنے دامن میں سمیٹتی گئی۔

کہیں کہیں الاؤ روشن ہو گئے۔

" تمہارے لئے بھی آگ روشن کر دوں؟" نریندر نے پوچھا

" اِس کی ضرورت نہیں۔"

" اس کی ضرورت تو محسوس ہو گی۔ جاڑے کے دن ہیں اور رات کو ریگستان میں سخت سردی پڑتی ہے۔"

راجکماری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

نریندر نے ادھر ادھر سے نیم کی کٹی ہوئی شاخیں اکٹھی کیں۔ آس پاس کی جھاڑیوں کو توڑا۔ مگر اس کے پاس ماچس نہیں تھی۔ اس نے راجکماری کی طرف دیکھا۔

" ماچس ہے۔"

" نہیں ہے"

" تو سگریٹ لائٹر ہو گا سنا ہے آجکل کی راجکماریاں سگریٹ ضرور پیتی ہیں۔"

" سگریٹ لائٹر بھی نہیں ہے"

" تو میں نیچے سے جا کر ماچس لے آؤں؟"

" تم میری طرف سے جہنم میں جا سکتے ہو۔" راجکماری نے جل کر کہا۔

نریندر مسکراتا ہوا ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔

ٹیلے سے نیچے اتر کر اس نے راجکماری کی طرف منہ کر کے چلا کے کہا "دیکھو اگر میرے جانے کے بعد کہیں کوئی شیر یا جنگلی جانور آ جائے تو راجکماری کی طرح لیے دیے اسی طرح مت بیٹھی رہنا۔ بھاگ کر درخت پر چڑھ جانا اور مجھے آواز دینا میں تمہاری مدد کو آ جاؤں گا۔ سمجھیں راجکماری؟"

راجکماری نے غصے میں ایک پتھر نریندر کی طرف لڑھکا دیا۔ پتھر نریندر کے پاس سے گزر گیا۔ اور ایک گڑھے میں جا کر گرا۔ نریندر ہنس کے ریل کی پٹری کی طرف چلا گیا۔

ریل کی پٹری کے کنارے کنارے اس سے ذرا ہٹ کر مسافروں نے جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے الاؤ روشن کئے تھے۔ اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سردی تھی اور یہ امکان بھی تھا کہ رات سردی اور بڑھ جائے گی۔ لیکن لوگوں کے دلوں میں حادثے کی ہیبت اسقدر طاری تھی کہ وہ گاڑی میں سونے کا نام بھی نہ لیتے تھے اس لئے۔ جن لوگوں کے پاس بستر تھے انہوں نے بستر باہر باہر ریت ہی پر بچھائے تھے۔

فراخدلی۔ ہمسائیگی اور وہ مساوات جو سب پر ایک ہی مصیبت پڑنے سے قدرتاً پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت بہت سے دلوں پر حاوی تھی۔ اس لئے ایک ایک بستر دو دو تین تین آدمیوں میں بانٹ دیا تھا۔ اگر کسی کے پاس بسکٹ تھے تو وہ خود نہیں کھا رہا تھا بلکہ دوسروں کے بچوں کو دے رہا تھا۔ پینے کا پانی چونکہ کہیں نہیں تھا اس لئے

لوگ مجبوراً گاڑی کے ان ڈبوں کے اندر جاکر جو ابھی تک صحیح سلامت تھے باتھ روم ٹینکوں سے پانی۔ وہ پانی جو صرف منہ ہاتھ دھونے کے کام آتا ہے لاکر پی رہے تھے لوگوں میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا ایک دوسرے سے میٹھا برتاؤ کرنے ایک دوسرے کو سمجھنے کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔

لیکن انسانیت کے اس روشن مظاہرے کے باوجود وہ فرق جو گاڑی کے ڈبوں نے انسانوں میں قائم کر رکھا تھا۔ کم و بیش وہی فرق گاڑی کے باہر بھی نظر آرہا تھا۔ یعنی تھرڈ کلاس کے ڈبوں کے بالعموم ایک جگہ بیٹھے تھے۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے والوں نے دانستہ یا دانستہ اپنے لئے ایک الگ جگہ اور تھرڈ کلاس والوں ذرا دور انتخاب کی تھی۔ اسی طرح فرسٹ کلاس اور ایرکنڈیشنڈ والے سیکنڈ کلاس والوں سے الگ دور ذرا اونچے بیٹھے تھے۔ راجکماری سب سے الگ تھلگ اکیلی دور سب سے اونچی بیٹھی تھی۔ اس جنگل میں بھی کسی نہ کسی طرح سے انسانی سماج نے اپنا امتیاز قائم رکھا تھا۔ نریندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ ریگستان نہیں ایک عالیشان دربار ہے۔ جس میں سب لوگ درجہ بدرجہ اپنے مرتبے اور مقام کے امتیاز سے بیٹھے ہیں۔ کسی نے انہیں مجبور نہیں کیا تھا۔ لیکن غالباً اپنی جماعتی عادت سے مجبور ہو کر وہ لوگ اپنے اپنے دائروں میں گھوم رہے تھے۔ نریندر نے گھوم کر اس پورے منظر پہ ایک اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اسے بے حد مزہ آیا۔ جماعتی احساس کی جڑیں بھی کتنی گہری ہوتی ہیں۔ اور پھر یکایک نریندر کے دل میں خیال آیا دائروں میں میری جگہ کہاں ہے۔

وہ لوہار کی بیوی کے پاس سے گزر رہا تھا۔ لوہار کی بیوی نے اپنے شوہر کے لیے ریت پر بستر بچھا دیا تھا۔ اور ایک میلی سی پوٹلی کو کھول کر اس میں سے باجرے کی روٹی

اور چٹنی اور ساگ نکال رہی تھی۔ اس کے قریب ایک گندمی رنگ کا نوجوان اپنی مضبوط ٹھوڑی اور اونچے دانتوں کی نمائش کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ایک لڑکی اپنے سیاہ بیضوی چہرے پہ بڑی بڑی آنکھیں جھکائے سرنگوں بیٹھی تھی۔

لوہار کی بیوی نے نربندر کو آواز دے کر کہا۔ "کھانا کھا لو"

نربندر نے کہا "نہیں تم کھاؤ"

لوہار کی بیوی نے اصرار کر کے کہا "نہیں لے لو کھانا بہت ہے"

نربندر کو اس نے ایک باجرے کی روٹی دی۔ تھوڑی چٹنی اور ساگ نربندر نے لوہار سے پوچھا۔

"تاجدین تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اچھا ہوں" تاجدین نے مسکرا کر کہا۔

لوہار کی بیوی نے گندمی رنگ کے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ جمال ہے موٹر مکینک ہے۔ یہ حمیدہ ہے۔ یہ بھی اسی کے گاؤں کی ہے۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ جمال کے ساتھ بھاگ کر آئی ہے"

لوہار کی بیوی ہنسنے لگی۔ حمیدہ نے اپنا منہ چھپا لیا۔ اور جمال کی پیٹھ سے لگ کر ہنسنے لگی۔

"بھاگ کر کیوں آئی ہے؟" نربندر نے پوچھا۔

اس کے ماں باپ اس کی شادی جمال کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ اس لئے —

جمال نے پیار سے اپنا ہاتھ حمیدہ کے کندھے پہ رکھ دیا۔ حمیدہ کی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں کے ارد گرد کی سفیدی بجلی کی طرح چمکی۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں

نریندر کو اس دلیر لڑکی کے کالے چہرے پہ محبت اور حیا کا ایک عجیب سا نکھار نظر آیا یکایک اسے باجرے کی روٹی اور چٹنی میں ایک عجیب سا مزہ محسوس ہوا۔

تاجدین نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کہا "اگر تمہارے ماں باپ ہماری شادی نہ کرتے تو کیا تم میرے ساتھ بھاگ جاتیں؟"

تاج تو کبھی نہ بھاگتی۔ اور پھر ہمارے ساتھ کبھی نہیں تم بہت بڑے ہو

عورت کے انکار میں کس قدر اقرار چھپا ہوتا ہے۔ اس کی ہٹ میں اپنے قریب بلانے کی کتنی تمنا ہوتی ہے۔ جب وہ کسی کو پیار سے گالی دیتی ہے تو اس کی گالی میں کیسی ایک شعر کی سی ناز کی سی اور پیار کی سی شیرینی پیدا ہو جاتی ہے۔

نریندر کی بھوک چمک اٹھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ روٹی کم پڑے گی"

"تو اور لو نا"

"نہیں کسی اور سے جا کے مانگتا ہوں"

روٹی واقعی کم تھی۔ اور تاجدین کو ضرورت ان سب سے زیادہ تھی اور گاڑی جانے کب اور کس وقت آئے۔ اس لئے لوہار کی بیوی نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ نریندر وہاں سے اٹھ کر چلنے لگا۔ تو یکایک اسے خیال آیا۔

"تمہارے پاس ماچس ہے؟" اس نے پوچھا۔

جمال نے جیب سے ماچس نکال کے دیدی۔

نریندر نے کہا "میں اسے واپس دے جاؤں گا۔"

چند قدم کے فاصلے پر پنڈت جی اپنی بیوی بچوں کے لیے بیٹھے تھے ان کی بیوی اپنے ساتھ کھانے پکانے کا سامان لائی تھی۔ اس نے سب سے الگ تھلک ریت کی ڈھیریوں کی ایک مینڈھ بنا کر الگ چوکا سجایا تھا۔ نریندر کو قریب آتے دیکھ کر بولی۔ "پرے پرے۔ چوکا ہے دیکھتے نہیں۔"

نریندر نے مسکرا کر پوچھا لڑکی کیسی ہے؟"

"سو گئی ہے"۔ پنڈت جی نے لڑکی کے چہرے سے پلو ہٹا کر بتایا۔

"بڑی سوندھی سوندھی پوریاں ہیں" نریندر نے اپنے نتھنوں سے سوں سوں کرتے ہوئے کہا۔

"کھاؤ نا جتنی چاہئیں"۔ پنڈت جی بولے۔ "بھگوان تو چلتے ہوئے گھر میں جتنا آٹا تھا۔ سب اٹھا لائی۔ میں نے کہا کسی کو دے ڈالو۔ مگر یہ نہیں مانی۔ بولی ان سے۔ ان کے لیے نو سنب کشٹ کرتے ہیں۔ یہ ان سے کار پل جائے۔ دیکھو کتنی عقلمند ہے۔ یہ پانچ آٹا یہاں کتنے کام آئے گا۔"

پنڈت جی نے نریندر کو بہت سی پوریاں دیں۔ اور آلو کی بھاجی بھی پھر انہوں نے ہاتھ جوڑ کر نریندر کو نمسکار کیا۔ اور اسے اپنی لڑکی کو بچانے پر دھنیہ باد کہا اور اچھی طرح شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت کیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اسے وہ ٹولی ملی۔ جس میں حاجی جیلی دلیا ئی وکیل مانہ خمی شاعر اور سندھی تاجر جنہوں نے اسے پلیٹ فارم پر دیکھ کر حرام زادہ کہا تھا۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب وہ ان کے قریب سے گزرا تو وہ لوگ باتیں کرتے کرتے چپ ہو گئے۔ اور کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے نریندر ایک لمحہ کے لیے رکا۔ مختصر سی خاموشی تھی۔ چھوٹا سا لمحہ تھا مگر بڑا تکلیف دہ تھا۔ وہ ایک اجنبی تھا۔ جو دوسری دنیا میں آگھسا تھا۔ نریندر نے رک کے کہا۔

"ڈاکٹر کا منتھ کہاں ہیں!"

"وہ بیچارہ زخمیوں کی مرہم پٹی سے ابھی تک فارغ نہیں ہوا!"

" نربندر پھر ایک لمحے کے لیے رکا۔ آخر جانے لگا۔

"اے .... مسٹر۔۔ زخمی سے نہ رہا گیا۔

نربندر پلٹا۔

زخمی نے کہا "بھئی ہم تو اگلے اسٹیشن پر اترنے والا تھا کھانے کو کچھ ساتھ لایا تھا۔ تھوڑی سی پوریاں دے دیتے جائیے۔ کہاں کس سے مانگیں۔ تم سے تھوڑی ملاقات تو ہے گو ذرا غلط سلط سی ہے۔" زخمی ہنسنے لگا۔ حاجی علیمی بھی۔

نربندر نے آگے بڑھ کر ساری پوریاں ان کے آگے رکھ دیں شاید ایک خفیف سے لمحے کے لئے انہوں نے توقف کیا ہو گا۔ پھر وہ سب بھوکے ان پوریوں پر ٹوٹ پڑے زخمی پوریاں کھاتے کھاتے رک گیا۔ اور اس لہجے میں بولا۔ مجھے اس وقت اپنا طوطا یاد آ رہا ہے۔ ہائے بیچارے کو موت بھی آئی تو کہاں آ گئی"۔۔۔ وہ پھر پوریاں کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اور کھاتے کھاتے نربندر سے کہنے لگا۔۔ تھوڑی سی اور نہیں دو گے۔"

نربندر رینڈٹ جی سے اور پوریاں مانگ کر لایا۔ تھوڑی سی انہیں دیں باقی اپنے پاس رکھیں اور پھر نیم کے پیڑ کی طرف چلا۔

مصیبت کے وقت گدھے کو بھی باپ کہنا پڑتا ہے۔" سندھی تاجر نے پوریاں کھاتے ہوئے کہا۔ گو اس نے فقرہ آہستہ کہا تھا مگر سب نے سن لیا سب ہنس پڑے۔ چلتے چلتے نربندر نے بھی فقرہ سن لیا تھا اسے غصہ تو بہت آیا۔ مگر وہ پلٹا نہیں۔ سیدھا نیم کے

رخت کی طرف بڑھتا گیا۔

راجکاری نیم کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں نریندر الاؤ روشن کیا۔ لکڑیاں چٹخیں، دھوئیں نکلا۔ شعلے بلند ہوئے۔ راجکاری کے پرنالچنے لگے۔ مگر ابھی تک راجکاری کی آنکھیں بند تھیں۔

نریندر نے دیکھا راجکاری کا سارا جسم کانپ رہا ہے اس نے الاؤ کی آگ کو جکاری کے ذرا اور قریب کر دیا اور پھر تنے کے قریب جا کے کھڑا ہو گیا۔

"راجکاری!"

"راجکاری!!"

"اے راجکاری!!!"

راجکاری نے آنکھیں کھول دیں۔ نریندر اس کے سامنے کھانا لئے کھڑا تھا۔ اس ایک ہاتھ میں پوریاں تھیں اور آلو کی بھاجی تھی۔ اور دوسرے ہاتھ میں باجرے کی ٹی اور چٹنی تھی۔

نریندر نے کہا "تمہیں بھوک لگی ہو گی"

نریندر نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

راجکاری نے سیاہ روٹی کی طرف دیکھا ہرے رنگ کی بدنما چٹنی کی طرف دیکھا یوں سے اسے سخت ہیک آئی۔ اس نے ہاتھ کے جھٹکے سے نریندر کے ہاتھوں کو جھٹک دیا۔ باجرے کی روٹی اور پوریاں ریت پر گر گئیں۔

نریندر آہستہ سے جھک کر ریت سے پوریوں کو اٹھانے لگا۔ آلو کی بھاجی ریت پڑی تھی۔ اور چٹنی میں ریت آ گئی تھی۔ اس نے پھونکیں مار مار کے پوریوں کو

ریت سے صاف کیا۔ اور ان سب کو ایک چھوٹی سی پوٹلی میں باندھ لیا۔ اور پھر اجکا
طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے راجکماری کو بھوک نہیں ہے یا شائد اسے یہ کھانا پسند نہیں آیا
اچھا ہے کل اپنے کام آئے گا۔"

نریندر پوٹلی باندھ کر الاؤ کے دوسری طرف بیٹھ گیا اور راجکماری کے چہرے پہ
ناچنے والے شعلوں کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔

"راجکماری میں سوچتا ہوں تم راجہ لوگوں کو سال میں ایک بار ضرور حوالات کی
سیر کرانی چاہیئے۔ ایک بار باجرے کی روٹی اور چٹنی کھلانی چاہیئے ایک بار پھٹے چیتھڑ
پہنا کر سردی کے دنوں میں باہر ریت پہ سلانا چاہیئے۔ پھر تم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عین
کے تم راجہ ہو وہ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں" نریندر نے کہا "مگر آج مجھے ایسی
باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔ آج تم اکیلی ہو راجکماری۔ بالکل اکیلی ہو آج تم اپنے شاہی محل
کی کھڑکی میں نہیں ہو۔ تمہاری خوابگاہ یہاں سے بہت دور ہے۔ آج تمہارے
لیے صرف ریت کا بستر ہے۔ اور پتھر کا سرہانہ ہے۔ نیم کا سایہ ہے اور جاڑے کی
سردی ہے۔ راجکماری سوچو جب سے تم پیدا ہوئیں اس وقت سے آج تک تمہاری پرجا
اسی بستر پہ سوتی رہی ہے۔ جس پر تم آج سوؤ گی۔ کیا تمہیں نیند آئے
گی راجکماری؟"

"اپنی بکواس بند کرو" راجکماری مٹھیاں بھینچ کے چلائی۔

نریندر چپ ہو گیا۔ پھر آپ ہی مسکرانے لگا۔ تھوڑی دیر وہ الاؤ کی لکڑیاں
الٹ پلٹ کرتا رہا پھر ایک جمائی لے کر ریت پہ دراز ہو گیا۔ دن بھر کی محنت اور

مشقت کے بعد اس کا جسم نیند کا سکون مانگ رہا تھا۔ نریندر نے کھانے کی پوٹلی کو اپنے سر کے نیچے رکھا۔ راجکماری کی طرف ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔

"راجکماری!"

راجکماری نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میں سوتا ہوں" نریندر بولا "اگر ڈر محسوس ہو تو مجھے جگا لینا یا اگر تمہیں میرا یہاں سونا ناگوار گزرے تو یہاں سے اٹھ کر کہیں اور چلے جانا۔ مگر مجھے پریشان نہ کرنا۔ مجھے نیند آ رہی ہے نریندر نے کروٹ بدلی اور سو گیا۔

آدھی رات کے وقت یکایک اس کی آنکھ کھل گئی۔ الاؤ بجھ چکا تھا چاروں طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کسی کے سرکنے اور دھیمے دھیمے سانسوں کی آواز آ رہی تھی۔ نریندر چپ چاپ لیٹا رہا۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں بند کر لیں پھر اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے سر کے نیچے سے پوٹلی سرکا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ سے بہت آہستہ سے نریندر نے اپنے سر کا بوجھ اس پوٹلی سے ہلکا کر دیا۔ اور پوٹلی اس کے سر کے نیچے نکال لی گئی۔ اس عمل کے دوران میں اس نے کسی کی انگلیوں کی لمس کو اپنے بالوں میں محسوس کیا۔ اور کافی تیز تیز مگر رکتی ہوئی سانس کی مدھم آنچ کو اپنے رخساروں پر محسوس کیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے محسوس کیا جیسے کوئی پوٹلی کھول رہا ہے۔ یکایک نریندر نے ہاتھ بڑھا کر پوٹلی کھولنے والے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا اور کہا۔

"چور! چور"

... ایک دبی سی چیخ سنائی دی اور نریندر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوٹلی کھولنے والے

کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

"تم راجکماری!" نریندر نے پہچان کر حیرت سے کہا۔

راجکماری کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ پوٹلی اس کے سامنے کھلی تھی۔

راجکماری خائف ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

نریندر نے پوٹلی اس کی طرف بڑھا کر کہا "لو کھاؤ۔ کھاؤ"

راجکماری نے ایک معصوم ڈری ہوئی لڑکی کی طرح آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا۔ جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو۔

"کھاؤ" نریندر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

راجکماری پوریوں پر ٹوٹ پڑی۔

وہ پوریاں کھاتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ راجکماری کو روتے دیکھ کر نریندر کا دل بھی بھر آیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک راجکماری تھی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اس وقت ایک مجبور بے بس، بھوکی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اکیلی اور مجبور۔ نریندر نے سوچا راجہ سے اگر اس کی طاقت چھین لو تو پھر وہ کیا ہے؟ دوسروں کی طرح ایک معمولی انسان!

راجکماری نے پوریاں ختم کیں۔ آلو کی بھاجی ختم کی باجرے کی روٹی ختم کی پھر اس نے ریت میں ملی چٹنی کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ نریندر نے کہا۔ ارے! ارے اس میں ریت ہے۔

مگر راجکماری ریت میں سنی چٹنی بھی کھا گئی۔

اس کے بعد بڑی کمزور آواز میں بولی۔ مجھے پیاس لگی ہے۔

پانی تو نہیں ہے نریندر نے جواب دیا۔

"مگر مجھے بڑی پیاس لگی ہے" ما جکاری نے بڑی عاجزی سے کہا:

"اچھا ٹھہرو میں کہیں سے پانی لاتا ہوں۔"

نربندا یہ کہہ کر نیچے ریل کی پٹری کی طرف چلا گیا۔ بہت سے الاؤ بجھ چکے تھے۔ کہیں کہیں کوئی اکا دکا روشن تھا۔ اور ان کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ تاش کھیل رہے تھے۔ نربندر وہاں سیدھا چلا گیا۔ جہاں پنڈت جی سو رہے تھے۔ اس نے پنڈت جی کو جگایا۔ پنڈت جی ایک دم ڈر کے اُٹھے مارے خوف کے انکی گھگی بندھ گئی۔ ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر حلق سے آواز نہ نکلتی تھی۔

"پنڈت جی میں ہوں نربندر۔ گھبرائیے نہیں۔"

پنڈت جی نے پہلے تو آواز پہچانی پھر چہرہ پہچانا جب جا کے کہیں ان کا ڈر دور ہوا۔ جب ڈر دور ہو گیا تو کھسیانے ہو کر ہنسنے لگے۔

نربندر نے کہا "تھوڑا سا پانی ہوگا؟"

پنڈت جی نے کمنڈل ہلا کے دیکھا۔ بولے "پانی ہے مگر کل کے لیے رکھا ہے۔"

"مجھے تھوڑا سا چاہیئے"

"لو پی لو"

"اپنے لیے نہیں۔ کسی دوسرے کے لیے"

"تو یہ کمنڈل لے جاؤ۔ مگر کرپا کر کے اس کمنڈل کو جھوٹھا نہ کرنا اور پانی پلا کے واپس کر دینا۔"

"اچھا!"

... نربندر کمنڈل لے کے واپس آیا۔

"راجکماری بولی" گلاس کہاں ہے ؟"

"گلاس نہیں ہے"

"تو پانی کیسے پیوں گی" اچھا ٹھیک ہے میں ایسے ہی پیئے لیتی ہوں"

راجکماری کمنڈل کو منہ لگانے لگی۔ نریندر نے روک دیا۔ بولا "پنڈت کا کمنڈل ہے منہ لگانے سے جھوٹا ہو جائے گا"

"تو پھر کیا کروں۔ کیسے پیؤں ؟"

"اوک سے پیو"

"اوک۔ اوک کیا ہوتا ہے ؟"

"ادھر آؤ میں بتاتا ہوں"

راجکماری نریندر کے قریب آگئی۔

"زمین پر بیٹھ جاؤ" نریندر نے کہا۔

راجکماری زمین پر بیٹھ گئی۔

"اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھاؤ"

راجکماری نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

نریندر نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کے اسے اوک بنا طریقہ سمجھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد راجکماری اپنی ہتھیلیوں کو جوڑے اوک سے پی رہی تھی۔ پانی پی کر وہ ہنسی بولی۔

"اس طرح پانی پینے سے بہت مزہ آتا ہے۔

"ٹھیک کہتی ہو بلو!"

"بِلّو کون ہے ؟"

"تم "

"میں بِلّو نہیں ہوں۔ رادھا کماری ہوں"

"میں تو بِلّو کہوں گا۔"

"بِلّو ۔ بِلّو۔" راجکماری نے دہرایا۔ عجیب سا نام معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں بِلّو ۔۔۔۔ نربندر نے کہا۔ ہمارے گھر میں ایک بلّی تھی۔ ہم اسے پیار سے بِلّو کہا کرتے تھے۔

راجکماری چیوں کی اسے کچھ غصہ آیا۔ کچھ ہنسی بھی آئی اس کے چہرے پر غصہ اور ہنسی چند لمحوں کے لیے جنگ کرتے رہے۔ آخر میں ہنسی غالب آ گئی۔ بولی

"میں نے تمہارے جیسا آدمی کبھی نہیں دیکھا"

میرے جیسے آدمی درباروں میں نہیں ملتے"

"تمہارا نام کیا ہے ؟" راجکماری نے پوچھا۔

"نربندر"

"نربندر ؟"

"ہاں"

"تم کیا کام کرتے ہو ؟"

"میں کوئی کام نہیں کرتا"

"کوئی کام نہیں کرتے !" راجکماری حیرت سے چلائی۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے ؟"

"ہو سکتا ہے۔ اس دنیا میں بہت سے ہیں جو کوئی کام نہیں کرتے مثا
کے طور پہ تمہیں لے لو۔ تم کیا کام کرتی ہو؟"

"میں راجکماری ہوں" راجکماری نے ذرا رخوت سے کہا۔

"ٹھیک ہے تم راجکماری ہو مگر یہ بتاؤ۔ تم کام کیا کرتی ہو؟"

راجکماری سوچنے لگی پھر سوچ سوچ کر ہنسنے لگی "دیکھا جائے تو بھی کو
کام نہیں کرتی ہوں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ مگر آج سے پہلے مجھے کبھی محسوس
نہیں ہوا کہ میں کوئی کام نہیں کرتی۔ کتنی عجیب بات ہے۔"

"ہاں آج کی رات ہر بات عجیب ہے" نریندر نے آہستہ سے کہا پھر
پنڈت جی کا کمنڈل دے آؤں۔"

جب نریندر پنڈت جی کو کمنڈل دے کے لوٹا تو راجکماری سو چکی تھی اس کا
ایک ہاتھ تکیے کی طرح اس کے سر کے نیچے تھا۔ دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر تھا۔
پلکیں رخساروں پر جھکی تھیں اور وہ زمین کی پستیوں اور آسمان کی بلندیوں
غافل ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح ریت پہ پڑی چمک رہی تھی۔

"بلّو۔!" نریندر نے راجکماری کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا اور پھر جا
سے بچنے کے لیے الاؤ روشن کرنے لگا۔

دسواں باب

سیٹھ پوتی لال نے اپنے منیم گردھاری لال کو بھیجکر بڑی عقلمندی سے کام لیا تھا۔ اس کی اسکیم کیا تھی۔ وہ ابھی اپنی سیٹھانی کو بھی بتانا نہ چاہتا تھا رات بھر اس سکیم کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اس رات اس کی آنکھوں میں سجریا کا حسن بھی تھا اسے کب سے صبح کا انتظار تھا۔ رات بھر وہ اسی بیم و رجا کے پلڑوں میں ایک پنڈولم کی طرح جکر کھاتا رہا۔ ابھی صبح کا ذب بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ اٹھ بیٹھا۔ پہلے اس نے سجریا کو جگایا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

سجریا نے سیٹھانی کی طرف اشارہ کرکے جو ابھی سو ئی ہوئی تھی کہا "اگر سیٹھانی آنکھ کھل گئی تو کیا سمجھے گی؟"

... "پوتی لال نے گھور کر کہا" میں کچھ کہہ رہا ہوں۔ تم کچھ سمجھ رہی ہو۔ تم میرے

ساتھ تو چلو۔"

سجریا نازو ادا سے اٹھی۔ اس نے اپنا لہنگا درست کیا اور مسکراتی ہوئی سیٹھ کے ساتھ چلی۔ پوچھنے لگی"

"کہاں چلو گے؟"

وہ ٹیلوں کے پیچھے جو پہاڑی ہے نا وہ جس کے اوپر سرخ برجی کھڑی ہے وہاں چلیں گے۔"

"مگر اتنی دور؟" سجریا نے کہا۔

"دور کہاں ہے آدھے پونے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

سجریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے سیٹھ کو تاکتی ہوئی سیٹھ کے آگے چلنے لگی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ دونوں سنگ سرخ کی برجی کے نیچے کھڑے تھے۔ برجی پہاڑی کی چوٹی پر تھی اس لیے یہاں سے دونوں طرف کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ جدھر ٹرین گری تھی ادھر سنگ مرمر کی سفید چٹانیں تھیں اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں۔ ریت کے ٹیلے تھے۔ ریت میں اٹی ہوئی چھوٹی سی وادی تھی۔ جس کے بیچوں بیچ وہ ریلوے لائن سیاہ فیتوں کی طرح بل کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔ برجی کے دوسری طرف ڈھلوان پر کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ کھڑے تھے ڈھلوان کے نیچے ایک نالا تھا۔ جو بالکل خشک تھا۔ اس کی تہ میں سفید و سیاہ پتھر چمک رہے تھے۔ نالے کے بیچ میں دو تین جگہ چھوٹے چھوٹے سے جزیرے نظر آتے تھے۔ جن میں درخت لگے ہوئے تھے برسات میں جب ان درختوں کے ارد گرد پانی بہتا ہوگا۔ تو اس ریگستان میں ان چھوٹے جزیروں کی ہریالی قابلِ دید ہوگی۔ مگر اس وقت تو ایک پیاسی۔

اسی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ پھر بھی چونکہ یہ ڈھلوان سورج کی اوٹ تھی اس لیئے ادھر ہریالی نسبتاً زیادہ تھی۔ نالے کے باہر ایک کشادہ جگہ میں دو لس کے گھر بنے ہوئے تھے۔ گھر کے سامنے کی زمین بتا رہی تھی کہ اس پر کچھ عرصے ہل نہیں چلایا گیا ہے۔ ان گھروں کے پس منظر میں پھر ایک پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا سوکھی ہوئی جھاڑیوں اور چٹانوں کا سلسلہ اس پہاڑی کی چوٹی پر ایک پرانے مندر یا جوتی کے معدوم ہوتے ہوئے آثار نظر آ رہے تھے۔ چوٹی سے نیچے اتر کر پہاڑی وسط میں تین چار بڑے لے غار نظر آ رہے تھے۔ پورا منظر اداسی ویرانی اور اجڑی ہوئی کیفیت کا حامل تھا۔

سیٹھ پوتی لال نے پہلے تو اپنی سانس قابو میں کی۔ پھر اس نے سانولی سالونی یہ کے چھریرے بدن کو اپنے فربہ جسم کے گردابوں میں سمیٹ لیا۔ پھر اس نے کہا۔ "ذرا ڈھلوان پہ کھڑی ہو کر ان گھروں کی طرف آواز تو دے شاید وہاں کوئی ہو۔"

سبجریہ لہنگا پھڑکاتی ہوئی برجی سے نیچے اتری۔ ادھر ڈھلوان پر چند قدم اتر کر ایک ن پہ کھڑی ہو کر اپنے منہ کے دونوں طرف ہاتھ رکھ کر چلائی۔

"ہو ہو ...... !"

"بھائی ہو ......"

"ہو ...."

سبجریا کی ہکتی ہوئی آواز چٹانوں سے پھسلی۔ جزیرے میں گری۔ پھوس کے گھروں ٹکرائی اور سامنے کی پہاڑی غاروں میں گم ہو گئی۔

سبجریہ نے تین چار بار آواز دی۔ لیکن ان دونوں گھروں سے کوئی باہر نہ نکلا۔

"وہاں کوئی نہیں ہے۔ سب اجاڑ ہے۔" سجریہ نے فیصلہ دے دیا۔ سیٹھ مایوس ہو کر برجی سے چلنے والا تھا۔ کہ اتنے میں ایک گھر سے ایک بکری نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ سیٹھ نے خوشی سے چلایا۔

"کوئی ہے! کوئی ہے!!"

"ہاں ہو گا کوئی۔" سجریہ نے سیٹھ کا تھل تھل کرتا ہوا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"وہاں چلیں گے" سیٹھ نے ندی کے پار دو گھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اتنی دور!" سجریہ نے پھر کہا۔ "دیکھو تو یہ جگہ کتنی اچھی ہے۔ پہاڑوں سے پرے صبح پھوٹ رہی ہے۔"

سیٹھ نے گھبرا کر جلدی سے کہا "جلدی چلو وہیں ... سے"

"مگر پھوس کے گندے گھروں میں کیا پڑا ہے؟" سجریا خفا ہو کر بولی۔

موتی لال نے غصے سے کہا "تم چلو تو"

سجریا سیٹھ کے آگے آگے چلنے لگی۔ ڈھلوان پر مشکل پگڈنڈیوں میں سجریا کو جگہ جگہ سیٹھ کو ہاتھ پکڑ کے اتارنا پڑتا تھا۔ خیر تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں پھوس کے ایک گھر میں داخل ہوئے مگر بالکل خالی تھا۔ پیچھے کی دیوار بیٹھ گئی تھی۔ اور پھوس بھی جگہ جگہ سے سرک گیا تھا۔ فرش پر بکریوں کی مینگنیاں بکھری پڑی تھیں۔ اور جانور کے پیشاب کی بو آتی تھی۔ ایک کونے میں ایک ٹوٹی ہوئی کھٹیا پڑی تھی۔

"ہائے رام!" سجریا نے اپنی چھوٹی سی ناک سکوڑ کر بڑی نفرت سے کہا۔ "یہاں تو میں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتی۔"

وہ جلدی سے اس گھر سے باہر نکل آئی۔ سیٹھ اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔ اور دوسرے گھر کے اندر جانے کے لیے مڑا۔

"مگر وہ بھی تو ایسا ہی ہوگا۔ دیکھ کر کیا کرو گے؟" سجریا پھر لہنگے کو گھٹنوں سے اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔

مگر سیٹھ گھر کے اندر چلا ہی گیا۔ "اونہہ" کہہ کے سجریہ بھی داخل ہوئی۔

اس گھر میں رہنے کے آثار تھے۔ چھت کا چھپر سر کا نہیں تھا۔ دیواریں گو اندر سے کالی تھیں۔ لیکن بیٹھی نہیں تھیں۔ تین چار بکریاں اجنبیوں کو اندر آتے دیکھ کر میں میں کرنے لگیں۔ اندھیرے کونے میں پڑی ہوئی کھٹیا پہ سے کسی نے کھانس کر سر اٹھایا۔ اور بولا۔

"کون ہے؟"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے کھٹیا سے لگی ہوئی لاٹھی اٹھالی۔ اور بستر سے اٹھ بیٹھا۔ یہ ایک بڈھا کسان تھا۔ اس کے سیاہ چہرے پہ دو آنکھیں جلتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے اپنی سفید داڑھی کو کھینچ کر ٹھوڑی کے دونوں طرف باندھ رکھا تھا اس کے مرجھائے ہوئے لٹکے ہوئے سیاہی مائل چہرے سے جھریاں یوں نیچے لٹک رہی تھیں جیسے کسی بڑے پیڑ کی شاخیں، اس کے چہرے پر گہری تشویش، ڈر، خوف، غصہ، جھلاہٹ اور مدافعت کے گوناگوں جذبے جھلک رہے تھے۔ وہ ان دونوں اجنبیوں کی طرف لٹھیا ٹیکتے ہوئے آگے بڑھا۔

"تم کون ہو؟"

"مسافر ہیں۔" پوتی لال نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"مسافر دکھائی نہیں دیتے" کسان نے بڑے شبہے سے کہا۔

پوتی لال نے کہا "پیاسے ہیں۔ پانی ملے گا؟"

"بڈھے نے سجریا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ادھر گھڑا کونے میں پڑا ہے۔ پانی پی لو۔"

سجریا نے سیٹھ کو پانی دیا۔

سیٹھ پانی پی کر بولا "یہ پانی کہاں سے آتا ہے؟"

"اپنا کنواں ہے"

"کہاں ہے باہر تو کہیں نظر نہیں آتا۔"

"باہر نہیں ہے نالے اندر جو بیچ کا ٹاپو ہے، جہاں پیپل کے درخت ہیں۔ وہاں ہے چاروں طرف سے درختوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس سے نظر نہیں آتا"

"نالے میں تو پانی نہیں ہے"

"مگر ہمارے کنوئیں میں ہے میرا کنواں بہت گہرا ہے۔"

"پانی بھی تو بہت ٹھنڈا ہے" سیٹھ نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

بڈھے کسان کے دل پر پھر شبہ ابھرا۔ بولا "تم نے بتایا نہیں تم کیوں آئے ہو؟"

سیٹھ نے اس کی بات نہیں سنی۔ اس نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر کسان کو دے دیا۔ روپیہ لے کر کسان اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی ہتھیلی پر چمکتے ہوئے روپے کو غور سے دیکھنے لگا۔

سیٹھ نے پوچھا "تم اکیلے رہتے ہو؟"

"نہیں میرا سب سے چھوٹا بیٹا میرے ساتھ رہتا ہے"

"وہ کہاں ہے؟"

"دربار واڑہ مہاراج گیا ہے۔ میرے لیے دوالینے۔ مجھے میعادی بخار آتا ہے"

"تمہارا بیٹا کب واپس آئے گا؟"

"پرسوں تک لوٹے گا۔"

سیٹھ چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا تم اپنا گھر، زمین، یہ کنواں کتنے میں بیچو گے؟"

بڈھا مسکرایا۔ بولا۔ "میں جانتا ہوں تم کو"

"کون ہوں میں بھلا؟" سیٹھ نے حیران ہو کے پوچھا۔

تم سیٹھ دولت رام کے بھائی ہو نا؟ سیٹھ دولت رام کے پاس میرا کنواں، میرا گھر، میری سب زمین گروی ہے۔ وہ میری زمین پہ یہاں حاکم لوگوں کے شکار کے لیے ایک بنگلہ بنانا چاہتا ہے نا۔ کیونکہ کنواں میلوں تک اور کہیں نہیں ہے مگر میں نے بھی قسم کھائی ہے۔ ایک انچ زمین نہیں بیچوں گا۔ اب اس کے لیے تم کو اس نے بھیجا ہے۔ میں سب جانتا ہوں"

پوتی لال نے کہا۔ "اچھا گھر اور زمین نہ بیچو کنواں بیچ دو"

"واہ! بڈھے کسان نے کھانس کر کہا۔ کنواں بیچ دوں تو پھر گھر اور زمین کیسے باقی رہیں گے۔ بڑے چالاک بنتے ہو نا"

پوتی لال نے ہنس کر کہا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ مجھے تمہارا کنواں چاہیئے نہ زمین نہ گھر۔"

.. "پھر کیا چاہیئے؟"

"سات دنوں کے لیے اپنا کنواں مجھے دے دو۔ جیسے میں چاہوں ویسے استعمال کروں۔ تمہیں بولنے کا حق نہ ہوگا۔ یہ لو دس روپے۔"

"دس روپے کم ہیں۔" بڈھے نے مشتبہ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ گو اس کا جی دس روپے لینے کو چاہتا تھا۔

سیٹھ نے دس اور بڑھا دیئے۔ بڈھے نے پھر انکار کر دیا۔

بڈھے نے کہا "نہ دس نہ بیس نہ تیس۔ پورے چالیس لوں گا۔"

سیٹھ نے پورے چالیس روپے دیئے۔

سجر یا حیران ہو کر کہنے لگی "مگر کا ہے کو۔ ہمیں کو نسا یہاں رہنا ہے۔"

"سیٹھ نے کہا۔ "تم چپ رہو نا"

بڈھے نے کہا۔ میں چالیس لوں گا۔ اور کسی کاغذ پہ دستخط بھی نہیں کروں گا۔ کہیں انگوٹھا بھی نہیں لگاؤں گا۔ اور روز نہ چار گھڑے پانی پینے کو لوں گا۔ سات دن کے بعد کنواں میرا ہوگا۔

"چار گڑھے نہیں دو گڑھے پانی لینے دوں گا" سیٹھ نے اصرار کیا۔ نہیں تو لاؤ میرے چالیس روپے واپس کرو۔"

بڈھے نے چالیس روپے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بنڈی میں ڈال کے کہا۔ "اچھا دو گھڑے ہی کافی ہوں گے۔"

جب سودا طے ہو گیا تو سیٹھ نے کہا "تمہارے پاس کوئی ٹٹکا ہے؟"

"ایک چھوڑ تین ہیں۔ مگر تین روپے لوں گا۔ بہت دور سے لانے پڑتے ہیں۔"

سیٹھ پوتی لال نے اسے تین روپے دیئے بڈھے نے وہ بھی بنڈی میں ڈال لیے۔

سیٹھ نے اس سے کہا "چلو کنواں تو دکھاؤ"

اور پھر بجریا سے کہا۔ "دو تینوں مٹکے بھی اٹھا لو۔"

سیٹھ یہ کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا۔ گھر کے اندر بڈھا اور بجریا دونوں رہ گئے۔ بڈھا بجریا کو مٹکے دیتے ہوئے بولا۔

"تمہارا سیٹھ پاگل تو نہیں ہو گیا ہے۔"

"باتیں تو کچھ ایسی ہی کر رہا ہے" بجریا ہنس کر بولی۔

"تم لوگ کہاں سے آئے ہو سات دنوں کے لیے اس کنوئیں کے پانی کا کیا کرو گے؟"

بجریا کچھ کہنے ہی والی تھی کہ باہر سے سیٹھ کی ڈانٹتی ہوئی آواز آئی۔

"بجریا ——!"

بجریا بھاگتی ہوئی باہر نکلی بڈھا کسان لاٹھی ٹیکتے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگا

"مجھے میعادی بخار ہے۔ چلا نہیں جاتا۔ دیکھو وہ سامنے جو ٹاپو ہے۔ وہ جہاں پیپل کے پیڑ کا جھنڈ ہے بس اس کے اندر چلے جاؤ وہاں کنواں ملے گا۔"

جھنڈ کے اندر واقعی ایک پرانا کنواں تھا۔ جگت پہ پھرکی۔ رسی۔ ڈول۔ سب کچھ موجود تھا۔ بجریا نے کنواں میں سر ڈال کے کہا۔

"باپ رے کنواں بڑا گہرا ہے۔"

کنوئیں میں اس کی آواز گونجی — "باپ رے کنواں بڑا گہرا ہے۔"

بجریا منہ باہر نکال کر ہنسی۔

پوتی لال نے اسے کھینچ کر چوم لیا۔ "اب کے ہیں تمہیں سونے کے کنگن بنوا دوں گا۔"

"دو دوسال سے کہہ رہے ہو" بجریا نے ٹھنک کر کہا۔

"مگر اب وقت آگیا ہے۔ اب تم جلدی سے یہ تینوں مٹکے پانی بھر لو۔ تینوں ایک بار اٹھا سکو گی؟"

"دوسرا پہ ایک کمر پہ اور ادھر ریل گاڑی تک لے جا سکو گی؟"

"اپنے گاؤں میں تو اٹھاتی تھی" سنجریا کچھ سوچ کر بولی مگر یہاں کا رستہ نیا ہے ابھی ایک ہی مٹکی لے جاؤں گی۔ دوسری بار دو ٹھلیاں بھر کے لے جاؤں گی تیسری بار شاید تینوں لا سکوں۔ مگر اتنا پانی کے جا کے کیا کرو گے؟"

"بیچوں گا" سیٹھ نے بڑی دلچسپی سے کہا۔"

"ہائے رام کہہ کے سنجریا کنوئیں کے جگت پہ بیٹھ گئی۔"

گیارہواں باب

سورج مشرقی پہاڑوں کے پیچھے سے سرخ اور بڑا سا نکل رہا تھا۔ راجکماری ایک دم گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ جیسے اس نے کوئی بڑا سپنا دیکھا ہو۔ اپنے ادگرد حیرت سے دیکھنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا۔ کہ کل جو کچھ ہوا وہ حادثہ نہ تھا ایک خواب تھا۔ مگر جونہی اس کی نظر گاڑی کے ڈبوں پر پڑی۔ ایک ایک کر کے رات کی بیتی ہوئی باتیں اس کے ذہن میں جاگتی گئیں۔

اطلس و کمخواب کے نرم و گداز بستروں پر سونے والی راجکماری آج رات ریت کے بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ اور کس مزے سے سوئی تھی۔ ایسی نیند کو اسے اپنے محل میں کبھی نہیں آئی تھی۔ اگر کوئی اس سے کہتا کہ اسے ایک دن نیم کے پیڑ کے نیچے کھلی ریت پر ایک اجنبی کے اس قدر قریب سونا پڑے گا۔ تو وہ کبھی یقین نہ کرتی مگر اب یقین

کیسے نہ کرتی۔ وہ اجنبی تو اس کے اس قدر قریب الاؤ کی دوسری طرف ریت پر ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ بالکل سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے سر کے نیچے تھے۔ بھیگی قمیض کے نیچے اس کے کالے بالوں والا ابھرتا گرتا ہوا مضبوط چوڑا سینہ نظر آ رہا تھا۔ سورج کی شعاعیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں مگر وہ اس لوشن سے بے نیاز ہو کر آنکھیں بند کئے گہری نیند میں کھویا ہوا تھا۔ راجکاری غور سے اس کے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔ اونچے رخساروں پر پلکیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں رخسار اور چہرے کے درمیانی حصے میں دونوں طرف گڑھے تھے۔ جو اس وقت داڑھی سے چھپے ہوئے تھے۔ راجکاری سوچنے لگی۔ بیشو کے بعد یہ آدمی کیسا معلوم ہوگا۔ پتہ نہیں کیسا ہوگا۔ مگر اس وقت تو بیشو کے بغیر ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے رات کو مجھے بلّو کہا تھا۔ یہ اجنبی کون ہے جو اسے مجھے بلو کہنے کا کیا حق ہے۔ حق تو نہیں ہے مگر میں اس کی زبان سے یہ لفظ سن کر خوش کیوں ہو گئی تھی۔ حق تو اسے یہ بھی نہ پہنچتا تھا۔ کہ ایک راجکاری جس کی خواب گاہ کے دروازے تک بھی کوئی مرد نہیں پھٹک سکتا تھا۔ یوں اس قدر قریب ہو کے سوئے مگر کیا کر سکتی ہوں۔ اگر یہ رات کو مجھے اپنے بازو میں لے لیتا تو میں کیا کر سکتی تھی۔ یہ تو اس کی شرافت ہے۔ مگر بلّو ــــ یہ لفظ راجکاری کے ذہن میں بار بار گھوم رہا تھا۔ کبھی تو یہ لفظ ایک پھول کی طرح کھل جاتا۔ کبھی ایک کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتا اور کبھی اس کے ذہن میں یہ پھول کی سی ملائمت اور کانٹے کی سی چبھن دونوں مل کے ایسی کیفیت پیدا کر دیتے کہ وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ ایک پھول سے کھیل رہی ہے یا کسی کانٹے سے الجھ رہی ہے۔ وہ اسی تذبذب کی حالت میں اپنے ملے جلے متضاد جذبات

کو سمٹی ہوئی سوئے ہوئے نریندر کو دیکھ رہی تھی کہ نریندر کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے دیکھ کر اسکے چہرے پر پھیلی ہوئی دھوپ کا خیال آیا اس نے زمین سے نیم کی ایک گری ہوئی شاخ اٹھائی اور اس کے چہرے پر سایہ کر دیا یکایک اس کا دل کانپنے لگا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اور پھر خون بڑی تیزی سے اسکے رخساروں پر چھلک اٹھا نیم کی شاخ اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ نریندر کی آنکھیں روشنی کے لمس سے پھر سکڑ گئیں۔ راجکماری نے پھر شاخ اٹھائی۔ اور اسکے چہرے پر سایہ کر دیا۔ اب اسے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ اور ایک ٹھنڈک سکون کے گہرے سائے اس کی روح کی روشن وادیوں میں پھیلتے گئے۔ اس لمحے میں اسے نریندر کا چہرہ بڑا معصوم بڑا بھولا بڑا پیارا معلوم ہوا یکایک اسکا جی آئینہ دیکھنے کو چاہا اور اسے خیال آیا کہ اس کی ساری میلی ہے۔ اس کے بال الجھے ہوئے ہیں اسکے ہونٹوں پر لپ سٹک نہیں ہے اور اسے سنوارنے والی شاطرہ اس سے بہت دور راج محل میں بیٹھی ہے۔

نریندر اس بے خبری کے عالم سوتا رہا۔ اس نے محبت کی اس کنواری شاخ کو نہ دیکھا۔ جو آپ ہی آپ ایک اندرونی جذبے سے بے قرار ہو کر اس کے چہرے پر جھک گئی تھی۔

آسمانوں پر پرواز کرنے والی۔ بادلوں سے کھیلنے والی [illegible] اسکے دل کے دریچوں میں اتر آئی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سویا ہوا تھا۔

راجکماری کا ایک ہاتھ تھک گیا۔ اس نے نیم کی شاخ کو دوسرے ہاتھ میں لیا۔ اور ایک مورتی ہی کی طرح آہستہ آہستہ پنکھا جھلنے لگی۔

نریندر گہری نیند سویا رہا۔ اسکا منہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ راجکماری کا دوسرا ہاتھ

بھی تھوک گیا۔ اور پھر کہ اس نے شاخ کو زمین پر پٹک دیا۔ پھر اس نے آہستہ سے زمین سے ایک چھوٹا سا سنگریزہ اٹھایا۔ اور اسے نریندر کے منہ میں ڈال دیا۔

شوں شر ڑاپ کی آوازیں نکالتا نریندر ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے سنگریزے کو زور سے تھوک کر باہر نکال دیا۔ راجکماری ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی وہ اس وقت بالکل ایک شریر بچے کی طرح ہنس رہی تھی۔ نریندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس وقت وہ بالکل ایک راجکماری نہیں ہے۔ ایک شریر لڑکی ہے۔ اس نے راجکماری کے ہاتھ مروڑتے ہوئے کہا۔

"تم نے میرے منہ میں مٹی ڈالی؟"

"ہاں!"

"پھر ڈالوگی؟" اس نے راجکماری کی بانہہ کو تھوڑا سا مروڑا۔

"ہاں ڈالوں گی" راجکماری درد کے مارے چلائی۔

"ڈالوگی ——؟" نریندر نے اسکے بازو کو اور کس دیا۔

"ڈالوں گی! ڈالوں گی!! ڈالوں گی!!!"

راجکماری غصے سے چلائی اور نریندر سے اپنا ہاتھ چھڑا کے بھاگی۔ نریندر اس کے پیچھے بھاگا۔ راجکماری چھوٹے ٹیلے سے پھلانگتی ہوئی دوسرے ٹیلے پر چڑھ گئی وہ ایک وحشی ہرنی کی طرح ننگے پاؤں بھاگتی جا رہی تھی۔ اور نریندر اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ دوسرے ٹیلے کو پھلانگ کر وہ ایک پہاڑی کے اوپر چڑھنے لگی جس چوٹی کے اوپر راجہ جی کی برجی چمک رہی تھی۔ چند منٹوں وہ ہانپتے ہوئے اسی برجی کے پاس پہنچ گئی۔ اور لنگڑاتے ہوئے اس کے سرخ فرش پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد نریندر بھی پہنچ گیا۔ ہانپتے ہوئے بولا "بہت تیز دوڑ لیتی ہو"

"ہاں زندگی میں پہلی مرتبہ بھاگی ہوں اور وہ بھی ننگے پاؤں" راجکماری ہنستے ہوئے اور ہانپتے ہوئے بولی، "مگر سانس پھول گئی۔ اور پاؤں میں کانٹا بھی چبھ گیا۔ اُف!"

"دکھاؤ۔"

نریندر نے راجکماری کا پاؤں اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ سنگِ مرمر میں ڈھلا ہوا مرمریں پاؤں۔ نریندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہاتھ میں کنول کا پھول تھامے کھڑا ہے۔ اس نے اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے پاؤں کی طرف غور سے دیکھا ایک جگہ سیاہ دھبہ نظر آرہا تھا۔ نریندر اپنے منہ کا لعاب لگا کے اس دھبے کو صاف کرنے لگا۔

"اوئی کیا کرتے ہو گدگدی ہوتی ہے" راجکماری نے غصے سے اپنا پاؤں کھینچا۔ مگر نریندر نے پاؤں نہیں چھوڑا۔ اُس نے پھر منہ کا لعاب لگا کر اس دھبے کو اچھی طرح صاف کیا تاکہ کانٹے کا منہ صاف دکھائی دے۔ کانٹا گوشت کے اندر اتر گیا تھا۔ نریندر نے گوشت اُسی جگہ سے ذرا دبایا۔

راجکماری درد سے بے تاب ہو کر چیخی۔

"ٹھہرو ابھی کانٹا نکالے دیتا ہوں"

اتنا کہہ کر نریندر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

برجی کے آس پاس سنگِ مرمر کی چٹانیں تھیں۔ سرخ پتھر کی چٹانیں تھیں کہیں کہیں اُگی ہوئی جھاڑیاں تھیں۔ یکایک چٹانوں کی اوٹ میں اسے تھوہر کا ایک پودا نظر آیا۔ وہ بھاگ کر اس کی طرف گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد تھوہر کا ایک بڑا سا کانٹا لے آیا۔ "اس کا کیا کرو گے؟" راجکماری نے پوچھا۔

"کانٹے سے کانٹے کو نکالوں گا" نریندر نے جواب دیا اور پھر راجکماری کا پاؤں اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ کانٹے کو پاؤں سے نکالنے لگا۔ جب کانٹے کا سرا اوپر آیا تو اس نے اپنے ناخنوں سے اُسے لینا چاہا لیکن اس کے ناخن بڑے نہ تھے اُسے یاد آیا کہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے اس نے اپنے دانتوں سے سارے ناخن کاٹ ڈالے تھے یہ اس کی بری عادت تھی۔

نریندر نے راجکماری سے کہا "تم اپنے ناخنوں سے کانٹا باہر نکال سکتی ہو اس کا منہ تو باہر نظر آ رہا تھا۔"

راجکماری نے بے ساختہ کہا "نہیں نہیں مجھ سے نہیں ہوگا۔"

راجکماری کے منہ سے نہیں کا لفظ سن کر نریندر بہت خوش ہوا اس نے کانٹے کے سرے کو غور سے دیکھا پھر اُسے اپنے دانتوں سے پکڑ لیا اور آہستہ سے کھینچ کر باہر نکال لیا۔

اس کوشش میں اس کے ہونٹ کئی بار راجکماری کے پاؤں سے لگ گئے اس کی زبان پر نمک تھا۔ زبان سے اُس نے اپنی ہتھیلی پر رکھا اور نریندر راجکماری کو دکھایا۔

"دیکھو یہ ہے تمہارا کانٹا"

جہاں سے کانٹا نکلا تھا وہاں وہ اب خون کی ایک بوند چمک رہی تھی نریندر دانتوں سے کانٹے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر راجکماری کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ اور اسوقت اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کے پاؤں میں ایک کانٹا ہے یا ایک بوسہ ہے یا ایک خون کی بوند ہے یا پارہ کی قسم

نکالو۔ اپنے طرح ڈھونڈنے لگا۔ نریندر کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کر نریندر کی ہتھیلی پر وہ کانٹا لرز رہا ہے۔ جو نہ جانے کتنی دور تک اسکی روح کے اندر دھنس گیا تھا۔ نریندر نے کہا "کیسی لڑکی ہو شکریہ بھی ادا نہیں کرتیں۔"

راجکماری نے کانٹے کو اس کی ہتھیلی سے لے لیا۔ اُسے غور سے دیکھا پھر اُٹھا اُسے ایک پتے میں موڑ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

"یہ کیوں؟" نریندر نے پوچھا۔

راجکماری کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ بولی "راج جی کو دکھاؤں گی دیکھو دن تمہاری بیٹی کیسے ننگے پاؤں بھاگی تھی۔ کیسے اسکے پاؤں میں کانٹا چبھا تھا۔"

"اوہ" نریندر نے مایوس ہو کر کہا۔ پھر رک کے بولا۔ "اب چل کے دیکھو چل سکتی ہو۔"

راجکماری ہولے ہولے زمین پر پاؤں رکھ کر چلنے لگی۔ منہ سے سی سی آواز نکالتے ہوئے نریندر کی طرف دیکھ کر بولی۔

"ابھی تک درد کیوں ہوتا ہے؟"

نریندر مسکرا کے بولا "ایسا ہی ہوتا ہے پگلی۔ کانٹا نکل جاتا ہے کھٹک بہت دیر تک باقی رہتی ہے۔"

نریندر نے بڑے پیار کی نظر سے اپنی پگلی کی طرف دیکھا۔ راجکماری نے منہ پھیر لیا۔ رات ہی رات کیا کچھ ہو گیا۔ کیا یہ سب کچھ خواب تو نہیں ہے۔ پرانی تاریخی برجی کے نیچے وہ تینوں بچپن رات بھر سوتے۔ سے پریشان ہو کے ردی کی چوری اور کی پاؤں ہوا۔ وہ نیم کی شاخ کا کھٹک جانا یہ کانٹا چبھنے کے گھاؤ سے اُٹھتی ٹیس

ہوتا ہے سرخ حلوان اور قیمتی قالین پر چلنے والے پاؤں آج کدھر جا رہے ہیں یقیناً" یہ سب کچھ خواب ہے ۔ یہ ہو نہیں سکتا ۔ یہ ناممکن ہے ۔ ابھی ابھی یہ سپنا ٹوٹ جائیگا" کا گھروندا ٹوٹ جائے گا ایک چھلاوے کیطرح فضا میں گم ہو جائے گا ۔ اور کوئی نما اس کے کان میں آ کے کہے گی ۔ اٹھئے راجکماری جی سورج سر پہ آ رہا ہے ۔

"کیا سوچ رہی ہو ؟"

راجکماری نے چونک کر زیندر کی طرف دیکھا ۔ پھر مجرموں کی طرح اپنی نگاہیں نیچی کر لیں ۔ انگوٹھے سے زمین کریدتی ہوئی بولی" سوچ رہی تھی کہ یہ کتنی اچھی ہے ۔ یہ برجی ۔ ہم یہاں کیوں نہ رہیں ۔ گاڑی سے اتنی دور گاڑی میں کیا رکھا ہے ۔ اور یہاں سے ہم ریلیف ٹرین کو دور سے آتے بھی دیکھ سکتے ہیں ۔ بس ۔ ریلیف ٹرین چند گھنٹوں میں آتی ہوگی ۔"

نرنیدر نے طنزاً کہا ۔ " ہاں محلوں میں رہنے والی راجکماری کیم کے بڑ کے رہے ۔ کم سے کم اسے یہ برجی تو چاہئے ۔"

راجکماری نے غصے سے اپنا پاؤں پٹک کے کہا" میں کیا تم سے اسونت راج کا سلوک کر رہی ہوں ۔ جو تم مجھے اس طرح طعنے دے رہے ہو ۔ کیا تم تھوڑے کے لئے یہ فرض نہیں کر سکتے کہ میں ایک راجکماری نہیں ہوں ۔ ایک معمولی [illegible] ہو گر نہیں تم کیسے بھول سکتے ہو ۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا وہ بھوکے ننگے اور بدنما ہوتے ہیں وہ ہمیشہ حیرت بھری نظروں سے ہمیں تاکا کرتے ہیں ۔ اگر بھگوان نے راج دیا ہے تو کیا ہم اسے چھوڑ دیں ۔ راستہ چلتے ہوئے لفنگوں کے حوالے کر دیں ۔

نرنیدر نے کہا" راجکماری اگر کوئی اور لڑکی رہ گئی ہو تو وہ بھی دے دو

نریندر خفا ہو کے بیٹھ گیا۔ اس نے راجکماری کی طرف پیٹھ کر لی۔ تھوڑی دیر کے بعد راجکماری اس کے پاس آئی اسے نریندر کا اس طرح روٹھ جانا بڑا ہی بھلا اور عجیب معلوم ہوا۔ انوکھا سا معلوم ہوا۔ اب تک اپنے محل میں رہی رہتی تھی اسے معلوم نہ تھا کہ کوئی اس سے کبھی روٹھ سکتا ہے۔ یکایک اس نے اپنا ہاتھ نریندر کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور بڑی کمزور آواز میں کہا۔

"روٹھ گئے نریں ۔۔۔؟"

نریندر نے پلٹ کر راجکماری کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک شریر مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ جو مجسم معصومیت تھی۔ نریندر نے پگھل کر کہا۔

"نہیں بلو"

۔۔۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس چپ چاپ بہت دیر تک بیٹھے رہے کتنی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ اس کا انہیں بھی اندازہ نہ تھا یکایک ان کے کانوں میں آواز آئی۔ "ہاں گرمی سے بچنے کے لئے یہ جگہ سب سے اچھی ہے" نریندر نے چونک کے دیکھا۔ وہ سندھی تاجر اپنی بیویاں ساتھ لئے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے کھنہ اور جھگن اپنے دوستوں کی بیویاں لئے ہوئے آ رہے تھے بیکنتا اور اما سے چلا نہ جاتا تھا۔ کھنہ اور جھگن بار بار انہیں سہارا دیتے ہوئے اور سہارا دینے میں تقریباً ان سے بغل گیر ہوتے رہے تھے۔ عورتیں کبھی ہنس پڑتیں کبھی مصنوعی طریقے پر خفا ہوتیں کبھی روٹھتیں اور پھر جس سے روٹھتیں اس کے بازو کا سہارا لے کر چلتے ہوئے اپنی اونچی ایڑی کے جوتوں اور پیٹی کوٹوں اور ساڑیوں کو سنبھالتے ہوئے بے ہنگم بطخوں کی طرح چٹان پر چڑھتی ہوئی آ رہی تھیں۔ ان سب لوگوں نے بڑی بے

آرکیٹ اہائستان کا سانس لیا۔ شکنبلا بولی اف ربٹ میں سونے سے میرا تو بند بند دکھ رہا ہے۔"

چھگن کھنہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

چھگن نے کہا" یہاں دھوپ نہیں ہے کھلی ہوا ہے پکا فرش ہے یوں ہم کسی ڈاک بنگلے میں آگئے۔"

امرتا نے چھگن سے کہا" میرے پاؤں میں شاید موچ آگئی ہے جوتا اتارا بھی تو نہیں جاتا"

چھگن امرتا کے جوتے اتارنے لگا۔

یکایک نریندر غصے سے کھڑا ہو گیا۔ بولا" تم لوگوں کو شرم نہیں آتی ہم لوگوں نے یہ جگہ پہلے سے ڈھونڈ نکالی ہے۔ اب تم قبضہ جمانے آئے ہو۔"

ایک سندھی تاجر آگے بڑھ کے بولا۔ ہاں۔ہاں بتاؤ۔ یہ جگہ تمہارے باپ کی ہے؟ سالے بھڑوے حرامزادے۔"

نریندر نے ایک گھونسہ اسے دیا۔ سندھی تاجر لڑکھڑاتا ہوا جا گرا پھر کھنہ آگے آیا۔ مگر نریندر نے اسے بھی اٹھا کے پٹخ دیا۔ کھنہ کی پتلون گھٹنوں پر سے پھٹ گئی۔ وہ چلا کے غصے سے بولا" میں کب سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ بڑے بدمعاش ہم پر رعب جماتے۔ ایسی بھولی بھالی رکشا دری کی جان بچا کے اپنے آپ کو کیا سمجھ بیٹھے ہو۔ پھر کھنہ نے پلٹ کر اجکماری کی طرف دیکھ کر کہا۔ یور رائل نس میں تو کب سے آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ کہ یہ آدمی چور ہے، مجرم ہے پولیس کا . . . .

نریندر نے کھنہ کو اس کا جملہ پورا نہیں کرنے دیا اس نے اس کے ایک ایسا گھونسہ جمایا کہ وہ جکرا کے چھٹکن پر گر پڑا

" ارے رے رے ۔ ایسا گول مال کیوں کرتے ہو ہم سب یہاں رہ سکتے ہیں ۔ بہت بڑی جگہ ہے اسمیں جھگڑا کرنے کی کونسی بات ہے ۔"

راجکماری اکارڈین) ہوئی ۔ اس نے نریندر سے کہا " ہم یہاں سجا ئیں گے ۔

راجکماری چلنے لگی ..

دوسرے سندھی تاجر نے گڑگڑا کے کہا " حضور سرکار آپ یہاں آرام فرمائیں ہمیں خوشی ہو گی ۔ ہم تو آپ کی طرف اس ...... "

نریندر نے گھونسہ تانا ۔ تاجر پیچھے ہٹ گیا ۔ اُس نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا راجکماری نے نریندر کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ " چلو "

نریندر راجکماری کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ۔

شکنتلا کھنہ کا گھٹنا سہلاتے ہوئے بولی " ڈارلنگ بہت چوٹ آئی ہے ۔ کیپ ــــ ؟ "

دوسرا سندھی تاجر اب تک راجکماری کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے پیچھے نریندر چل رہا تھا ۔ اس نے آہستہ سے نریندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے دوسرے تاجر دوست کی طرف جھک کر کہا " کیا قسمت ہے سالے کی ! "

———

بارہواں باب

دھوپ تیز ہو چکی تھی۔ گو آفتاب کے نکلے دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے لیکن لوگ ابھی سے تمازت محسوس کرنے لگے تھے۔ اور ریل کی پٹری چھوڑ کر درختوں کے نیچے یا جھاڑیوں کے سائے میں یا ٹیلوں اور ٹیلوں کی اوٹ میں سورج کی تیز کرنوں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کیمپ ریل کے کنارے کنارے دور تک لوگ گوڈ بو کے باہر بیٹھے تھے۔ لیکن لائن کے باہر بھی انہوں نے ناوانستہ طور پر یہ کوشش کی تھی کہ جہاں تک ہو سکے۔ اپنے اپنے ڈبوں کے سامنے ہی کیمپ لگائیں اگرچہ ٹرین اتر چکی تھی پھر بھی یہ صورت تھی کہ حادثے سے پہلے جو جس ڈبے میں بیٹھا تھا۔ ابھی تک شعوری طور پر اسی ڈبے سے چپکا ہوا تھا لیکن جب دھوپ تیز ہونے لگی۔ تو یہ کیمپ بکھر گیا۔ گو ابھی ریل گاڑی سے اتنی ذہنی وابستگی ضرور تھی کہ درختوں

چٹانوں، پیریوں اور شیلوں کے سایوں کے تلے بیٹھ جانے کے باوجود ایک ایسی تشنگی سی بھی تھی۔ کہ جہاں تک ہو سکے ریل گاڑی اور ریل کی لائن ان کی نظر کے سامنے رہے تو اچھا ہے۔ یہ ریل کی لائن جس کا سلسلہ اُن کے گھروں سے ملتا تھا۔ ان کے کاروبار سے ملتا تھا۔ ان کے سماج اور ان کی روزمرہ زندگیوں سے ملتا تھا۔ ان کی نگاہوں میں اُمیدِ تہذیب اور مستقبل کی ایک نہایت ہی شدید اتفاقے کو پیدا کر رہی تھی۔ مختلف کیمپوں میں دور دور ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود سب کی نظریں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے بھی بار بار ریل کی لائن کی طرف اٹھ جاتیں۔ اور لوگ ادھر ادھر چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے بار بار نگاہیں اٹھا کر دیکھتے کہ کہیں ریلیف ٹرین تو نہیں آ رہی ہے جس کے بغیر ان کا سلسلہ حیات تہذیب سے تمدن سے اور سماج سے نہیں جڑ سکتا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہنستے ایک دوسرے سے جھگڑا کرتے ایک دوسرے کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ لیکن گھوم پھر کر ان کی نگاہیں ریل کی پٹری ہی پر جم جاتیں۔ یہ آہنی کارخانوں میں ڈھلی ہوئی ریل کی پٹری جو ایک گاؤں کو دوسرے گاؤں اور ایک شہر کو دوسرے شہر سے اور ایک محبت کو دوسری محبت سے ملاتی ہے کس قدر صاف اور واضح صورت میں بتاتی ہے۔ کہ ایک سماج گیا۔ اور دوسرا سماج آیا۔ اور جب تک ہم اس ریل کی پٹری کو اکھاڑ کر نہ پھینکیں ہم پچھڑے ہوئے سماج واپس نہیں لا سکتے۔

زخمی شاعر اس طرح اپنے خیالات کی تشریح کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی بیریوں کے جھاڑ کے نیچے حاجی علیمی۔ رمن دلسبائی اور سردار گوردیال سنگھ اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ رمن بھائی بولے ٹرین کے ایک ہی حادثے میں چکرا گئے۔

وہ اپنی آزادی والی بات سب بھول گئے تھے زخمی بھائی تم کو کس نے منع کیا ہے! دربار والا مہاراج چلے جاؤ۔ یہیں جاؤ جھگڑے میں جاؤ۔ کیوں گاڑی کی امید اس ریلوے لائن سے چپکے بیٹھے ہو۔ کیوں تمہیں یہ لائن ایک مقناطیس کی طرح کھینچتی ہے؟"

زخمی نے اقرار کیا "کھینچتی ہے سالی بار بار کھینچتی ہے۔ جھگڑے پر جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"گویا جھگڑے والی آزادی تمہیں پسند نہیں!"

زخمی چپ رہا۔

رمن وبھائی نے کہا "تمہاری خاموشی کے بہت سے مختلف مطلب ہو سکتے ہیں۔"

زخمی نے کہا "کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے یہ ریلوے لائن کارخانوں سے نکلی ہوئی آہنی زبان ہے۔ جو میرا منہ چڑا رہی ہے جو مجھ سے بار بار کہتی ہے اب وہ پرانی آزادی کا تصور بدل گیا۔ شخصی آزادی اور سماجی آزادی کے نئے تصوروں میں دو دن گی۔ میں جو گاؤں اور شہروں میں گھومتی ہوں کھیتوں کو کارخانوں اور کارخانوں کو بندرگاہوں اور ساحلوں سے باندھتی ہوں۔ زندگی کا نیا تصور میں دوں گی۔ میں کارخانے کی بیٹی ہوں۔ اس لئے زندگی کا اور محبت کا اور سماج کا نیا تخیل میرے اردگرد پیدا ہوگا۔"

سردار گوردیال سنگھ ملٹری کنٹریکٹر خفا ہو کے بولے۔

"اے چھوڑو یار شاہو۔ اے جھلی بہو سیدا نہ پیچ نہ بہاؤ۔ کوئی اچھا سا گیت سناؤ۔"

ایک تو ہماری ٹرین الٹی ہے۔ دوسرے تم نے ایسا کیا سنا دیا ہے ہو۔ ایسی بکواس بند کرو۔"

زخمی کو بڑا غصہ آیا۔ بولا"

"سردار جی! آپ بڑی بے عزتی کر رہے ہیں۔"

"اور یہاں بیٹھ شاعر دیا بھُمنا ایک تو ہم کو بجلی نہیں سناتے ہو۔ اوپر سے آکر ٹانے ہو بھیتی اس تو تیری جان ہے ایک گھسن دوں گا۔ جان نکال لوں گا۔" یہ

یہ کہتے ہی سردار گوردیال سنگھ ملٹری کنٹریکٹر نے ایک گھونسا دکھایا۔ حاجی عبید بیچ میں آگئے۔ بولے۔

"سردار جی رہنے دو۔ یہ بے چارہ شاعر ہے کوئی ہماری آپ کی طرح دنیادار تو ہے نہیں۔ یہ شاعر تو بیچارے ہوتے ہی ہیں۔ الٹی سیدھی باتیں سوچا کرتے ہیں۔"

"ہاں ذرا دلچسپی کے لئے اپنے ساتھ رکھ چھوڑا ہے اور کیا" رمن نے لقمہ دیا۔

"تو کیا مجھے آپ نے کوئی پالتو بندر یا سمجھ رکھا ہے جو آپ کا دل خوش کرتا رہوں گا؟" زخمی غصے سے بولا۔

گوردیال سنگھ ملٹری کنٹریکٹر زور زور سے ہنسنے لگا اسکا سارا غصہ ڈھل گیا۔ زخمی کی پیٹھ پہ ہاتھ مار کے بولا "بچو! اب سمجھا ہے تو اپنا پیشہ۔ دیکھو جیسے ہم کھانے کے بعد ذرا سا میٹھا کھاتے ہیں نا۔ اسی طرح محنت اور کام کرنے کے بعد مجھ کو شاعری اچھی لگتی ہے۔ شراب اچھی لگتی ہے، عورت اچھی لگتی ہے یہاں اور کچھ تو ہے نہیں سالے دیکھنے کو تو یہ تو ہے۔ بچو لے اب ویسٹ نہ کر، تیرت مجھ کو

گجل سنا دے ۔ تیرے پاؤں پڑتے ہیں شاعر صاحب!" گوردیال سنگھ نے شاعر کی کھوڑی کو ہاتھ لگایا ۔ زخمی مسکرانے لگا۔ بولا

"سناتا ہوں مگر پیاس بہت لگی ہے ۔ حلق میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں"۔

"مگر پانی کہاں ہے؟ گاڑی میں جتنا پانی تھا ۔ وہ راتوں رات لوگوں سے نکال نکال لیا اب تو ریلیف ٹرین کا راستہ دیکھنا پڑے گا"

زخمی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ٹرین جانے کب آئیگی اس طرح تو پیاس سے مرجائیں گے"

اتنے میں اس کی نظر ایک پھولدار لہنگا پہنے ہوئے جوان لڑکی پر پڑی۔ جو سر پہ مٹکی اٹھائے جارہی تھی ۔ اور آواز دے رہی تھی ۔

"پانی ـــ پانی ـــ دو آنے میں ایک گلاس پانی۔ ٹھنڈا میٹھا پانی دو آنے میں ایک گلاس پانی"

"یہ سجریا تھی ۔

زخمی آواز سنتے ہی لپکا ۔ گوردیال سنگھ حاجی عیسےٰ اور رمن بھائی بھی ننگے پاؤں ننگے سر بھاگے ۔ پیاس سب کو لگ رہی تھی ۔ سجریا کی آواز سن کے ادھر ادھر درختوں اور جھاڑیوں میں چھپے ہوئے آدمی بھی بھاگتے ہوئے نکل آئے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے سجریا کی مٹکی خالی ہوگئی ۔ مگر پیاس پھر بھی باقی تھی ۔ لوگوں کا مجمع سجریا کے گرد جمع ہوگیا ۔

"پانی ـــ"

"پانی کہاں ہے؟"

"پانی اور چاہیئے۔"

"ہم تین آنے گلاس دیں گے۔ تھوڑا سا پانی اور دے دو۔"

سجریا نے کہا "مٹکی خالی ہو گئی اور دوسری بھر کے لاتی ہوں۔"

"کہاں سے بھر کے لاتی ہو! ہمیں دکھا دو"

سجریا نے کہا۔ جگہ تو کہیں نہیں ہے رات کو میں نے ٹینکوں سے بہت سا پانی نکال کے دو تین ڈرموں میں بھر لیا تھا۔ وہ اس ٹیلے کی اوٹ میں سیٹھ پوتی لال بیٹھے ہیں۔ میں ان کی نوکرانی ہوں۔ پانی ان کے پاس ہے۔ آپ کو چاہیئے تو میں لا کے دیتی ہوں پر اب کے تین آنے گلاس ملے گا۔"

"تین آنے دیں گے۔"

" سجریا دوسری مٹکی بھرنے کے لئے گئی۔ لیکن اس کے پیچھے پیچھے لوگوں کا ایک جم غفیر ہو لیا۔ جہاں جسے پتہ چلتا کہ سیٹھ پوتی لال کے پاس پانی ہے۔ وہ وہیں سے بھاگ کر مجمع کے ساتھ ہو لیتا۔ جب یہ مجمع سیٹھ پوتی لال کے ٹیلے کے پاس پہنچا تو سیٹھ نے پہلے ہی سب انتظام کر رکھا تھا۔ وہاں دھانا پہلوان اور فقیرا پہلوان اپنے پٹھوں کے علاوہ چھ سات اور تگڑے اور مضبوط جسم کے آدمیوں کے ساتھ موجود تھے۔ سیٹھ پوتی لال نے انہیں نوکر رکھ لیا تھا۔

وہ لوگ پانی کی حفاظت پر اور پانی بیچنے پر مامور تھے۔ سیٹھ پوتی لال ایک طرف بستر بچھائے ٹیلے سے ٹیک لگائے بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ پانی تین بڑے بڑے ڈرموں میں بھرا ہوا تھا۔ جو پوتی لال کے کہنے کے مطابق اپنے

گاڑی کے ملبے میں سے تلاش بسیار کے بعد حاصل کر لئے تھے۔ ان ڈرموں کے علاوہ اچھے مٹکے تھے چند ایک بالٹیاں تھیں۔ کچھ صراحیاں تھیں کچھ دوسرے الٹے سیدھے برتن تھے غرضیکہ کموڈ کے سوا ہر قسم کا برتن موجود تھا جس میں کسی طرح سے پانی ڈالا جا سکتا تھا جوں جوں سورج چڑھتا گیا مجمع بڑھتا گیا لوگوں کا شور بڑھتا گیا۔

"پانی پانی"

لوگ زور زور سے چلانے لگے۔ ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے کئی صفوں میں نوبت گھونسے بازی تک پہنچ گئی۔ پہلوانوں کو مجمع کے سنبھالنے میں بہت دقت سی تھی۔ عنقریب یہ ہونے والا تھا کہ لوگوں کا رش اسقدر بڑھ جاتا کہ پانی کے ڈرم بھی الٹ جاتے۔ اس موقع پر رمن بھائی بیرسٹر نے جو بمبئی کا ایک سحر البیان مقرر بھی تھا ڈھکنا اور زور زور سے ہاتھ ہلا کر تقریر کرنا شروع کر دی۔

"بھائیو! اور بہنو! میں جانتا ہوں کہ آپ پیاسے ہیں اور آپ کی پیاس صرف ہی سے بجھ سکتی ہے۔ اور پانی یہاں موجود ہے لیکن اگر آپ اسی طرح دھکم دھکا کرتے اور ایک دوسرے سے جھگڑتے رہے تو پانی کسی کو نہیں ملیگا اور یہ پانی جس سے ملن کی جانیں بچ سکتی ہیں ہمارے آپس کے بیکار جھگڑے میں ضائع ہو جائیگا بھائیو! رہنماؤں میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ آپ مہذب اور متمدن شہریوں کی طرح لائن ایک کنوئیں پر کھڑے ہوں اور باری باری پانی پیتے جائیں اور جیسے جیسے ہٹتے جائیں اس ن میں پانی پہلے ہوئے سونے سے بھی۔ بادہ قیمتی ہے مہربانی کر کے صرف اتنا پانی لیجئے جتنی پیاس ہے کہ اس سے بھی کم لیجئے کیونکہ پانی کم ہے لوگ آپ کی پیاس بہت زیادہ ہے پھر دوپہر آ رہی ہے۔ اس لئے جلدی کیجئے لائن لگائیے کنوئیں پر کھڑے ہو جائیے۔

"شاباش ... شاباش ....."

رمن بھائی ہدایت دیتا گیا۔ لوگ آہستہ آہستہ کنویں پر کھڑے ہونے گئے جب رمن بھائی نیچے سے اترا تو اس نے پونی لال کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کے کہا سیٹھ پہلوانوں ہی سے کام نہیں چلتا کچھ عقل بھی چاہیئے۔"

پونی لال نے اس کا ہاتھ دبایا۔ بولا میں آپکا خادم ہوں آپ کو جب پانی چاہیئے۔ جتنا چاہیئے مفت حاضر ہے۔"

کنویں پر چونی کا بھائی منو بھی کھڑا تھا۔ اس نے کہا میرے پاس ایک آنہ ہے میں آدھا گلاس پیونگا۔

"پیسے کا بچہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک پہلوان نے اسے کیوں دھکا دے کر ہٹا دیا۔"

"اچھا اچھا" منو نے بڑی اداسی سے کہا "دو آنے ہی لے لو۔"

"اب پھر لوو پیسہ آدھ" سیٹھ کا آدمی چلایا۔

ایک عورت نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنے بچے کیطرف دیکھ کر کہا "غریب لوگ ہیں۔ میرے پاس صرف دو پیسے ہیں۔"

"جاؤ جاؤ۔ یہ کوئی دھرم شالہ نہیں ہے یہاں سے دس میل سے پانی لاتے ہیں چلتے چلتے کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ دو پیسے سے کیا ہوگا!"

پہلوان نے پیسے ریت پر پھینک دیئے۔

بچہ چلایا "پانی پانی۔ ماں۔ پانی۔"

ماں نے جھک کے ریت سے دو پیسے اٹھا لیئے اور حسرت بھری نگاہ سے لوگوں کو پانی پیتے ہوئے دیکھنے لگی۔

منو ہوتے ہوئے ماں کے پاس آیا اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔

" ماں! تمہارے بیٹے کو پیاس لگی ہے؟ "

" ہاں بیٹا۔ "

منو کا ہاتھ دیر تک جیب میں رہا پھر اس نے جیب سے ایک میٹھی گولی نکالی اور اسے بچے کے منہ میں دے دیا۔ بچہ روتے روتے چپ ہو گیا تھوڑی دیر تک گولی چوستا رہا۔ پیاس کو نہیں بجھا سکتی شفقت محبت کا بدل نہیں ثابت ہو سکتی بھوک سے نا بلکنے سے نہیں مٹ سکتی۔ بچہ پھر چلانے لگا۔ منو نے اپنی ہتھیلی پر اپنے پیسوں کو گنا۔ پاس کل تیرہ آنے تھے۔ اس نے ان آنوں کو دو تین بار گنا۔ دو تین بار اس نے منو نے بچے کی طرف دیکھا ماں کے مایوس چہرے کی طرف دیکھا آخر اپنے دل کڑا ان تیرہ آنوں میں سے دو آنے نکالے اور ماں کو دے کر کہا۔

" لو اسے پانی پلا دو۔ "

" پھر وہ اپنا ڈبہ کھڑکھڑاتے ہوئے کیو کے سامنے اپنی گولیاں بیچنے لگا۔

" ٹھنڈی میٹھی گولیاں ایک آنے میں دو۔ ایک آنے میں دو گولیاں کھاؤ۔

سکو کھول جا دو۔ گولی کیا ہے میٹھے شربت کا گلاس ہے صرف ایک آنے میں دو

حاجی عیسیٰ نے خفا ہو کے زخمی سے کہا ہم مسلمانوں کو تجارت کرنی نہیں آتی جبھی کم بخت نتھیا کیسی دور کی کوڑی لایا ہے سامنے ریت سے بھی سونا پیدا کر

" زخمی خوش ہو کے ہنسا بولا

" تم مسلمان ہمیشہ بدھو کے بدھو رہو گے۔

" حاجی عیسیٰ نے بچپن کے پھر زخمی سے کہا اگر یہ پوتی لال۔ کمبخت پانی کہاں

سے لایا ہے۔
زخمی نے کہا ٹینکیوں کو خالی کر دیا ہے اس نے رات میں یہی کام کیا ہے
اس طرف سے ایک اور آدمی نے جو شکل وصورت سے مولوی معلوم ہوتا تھا
کہا "نہیں بھائی سنا ہے۔ یہاں سے دس میل پر ایک گاؤں ہے تال ہے اس سے پانی
منگوایا ہے۔ مگر داد دینی پڑتی ہے اس کی عقل دفراست کی"
نریندر نے راجکماری سے کہا اگر یہ پانی مفت تقسیم کرتا تو کتنا اچھا ہوتا۔
غریب اسے دل سے دعائیں دیتے۔
پنڈت جی نے کہا۔ دعائیں تو دیتے مگر پیسے تو نہ دیتے۔
نریندر نے کہا پنڈت جی بڑی خوشی سے چہک رہے ہو کیا بات ہے؟
پنڈت جی نے کہا ابھی میرے کمنڈل میں پانی ہے۔
نریندر نے راجکماری سے کہا پانی پینے کے لئے کنوئیں پر کھڑے ہو جاؤ
راجکماری نے شرمندہ ہو کے کہا مگر میرے پاس تو۔۔۔"
راجکماری رک گئی۔
نریندر سمجھ گیا ہنس کر بولا۔ اپنا بھی یہی حال ہے۔
"میرا تو بٹوا کسی نے ریل میں اٹھا لیا تھا۔ ورنہ۔۔۔۔"
"کوئی حرج نہیں" پنڈت نے اس سے آنکھ مار کے کہا میرے کمنڈل میں پانی ہے
دوپہر تو کسی نہ کسی طرح نکل جائے گی پھر ریلیف ٹرین آجائے گی۔
اب بہت سے لوگ دل ہی دل میں ریلیف ٹرین کیلئے دعائیں مانگ رہے تھے
بیوی اپنے شوہر کو پانی پلا رہی تھی تاجدین اپنے بستر سے اٹھ کر ملبے پر گیا اور

کو بالکل بھلا چنگا محسوس کر رہا تھا ۔ صرف نقاہت باقی تھی ۔

" ڈاکٹر کا منہ کہتا تھا " تاجدین بولا " اگر تم آدھے گھنٹے تک اور ایسے ہی دبے رہتے تو تمہاری دونوں ٹانگیں کاٹنی پڑتیں "

لوہار کی بیوی نے ڈر کے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیئے

جمال اور حمیدہ دونوں اس کے پاس بیٹھے تھے ۔ جمال نے پانی والوں کے کیوں کی طرف دیکھ کر کہا " یہ لوگ گدھوں کی طرح جاہل ہیں "

" کیا مطلب ؟ " تاجدین نے پوچھا

جمال آہستہ سے مسکرایا ۔ بولا " کچھ نہیں یوں ہی کہہ رہا تھا "

پھر وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھا اور بوٹی لال کے ٹیلے کی طرف چلا گیا اور جاتے جاتے تاجدین سے کہہ گیا " میں ذرا دیر میں آؤں گا ۔ تم حمیدہ کا خیال رکھنا ۔ "

جوں جوں دھوپ تیز ہوتی جاتی تھی ۔ پانی کا بھاؤ بڑھتا جاتا تھا پانی دو آنے کا گلاس بکا ۔ پھر تین آنے میں ۔ دوپہر کے وقت پانی چار آنے کا گلاس رہا تھا ۔ فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس والوں اور انٹر کنڈیشنڈ ڈبے والوں کیلئے تو خیر چار آنوں کی حقیقت کیا تھی لیکن تھرڈ کلاس کے ڈبے والے اس مہنگائی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے ۔ اور اب وہ لوگ کھلم کھلا پانی والوں کو گالیاں دے رہے تھے ۔

دوپہر کے وقت بہت شدت سے تپنے لگی آسمان سے آتشیں کرنوں کی بارش ہو رہی تھی ۔ جسم کا روان رواں اس گرمی سے تپا جا رہا تھا ۔ نہ صرف پیاس ہی تیز ہو گئی تھی بلکہ لوگوں کی بھوک بھی حد سے بڑھ

بھی ہیں لیکن جنڈ ایک کو چھوڑ کے گاڑی کے بارہ تیرہ سو مسافروں میں سے کسی کے پاس اب کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ہر ایک کی نظریں اس وقت وہیں کو یہ دور تک بچھی ہوئی تھیں۔ رلیف ٹرین کب آئے گی ۔

سیٹھ پوتی لال نے دو آدمیوں کو ٹیلے پر کھڑا کر رکھا تھا۔ کہ جب کبھی وہ رلیف ٹرین یا کسی آدمی کو یا کسی گھوڑے سوار کو آتے دیکھیں تو اسے اطلاع دیں۔ کہ کوئی ایک بجے کے قریب ٹیلے پر چڑھے ہوئے پہلوانوں نے کہا۔ تین "سانڈنی سوار نظر آ رہے ہیں۔"

پوتی لال نے ٹیلے پر چڑھ کے دیکھا۔ اور اتنی دور سے گردھاری کو پہچان لیا جو سانڈ بینوں پر سامان خورد و نوش لادے تیزی سے سانڈنیاں چلاتا آ رہا تھا سیٹھ نے خوشی سے اپنے ہاتھ ہلائے۔ اپنی موٹی سیٹھانی سے "گوبند کی ماں اب دیکھنا نِرا دھن آئے گا۔"

گردھاری تیم اپنے ساتھ بہت سا سامان لایا تھا۔ آلو۔ پیاز مرغ انڈے ڈبل روٹی، ساگ، نمک، مرچ۔ گھی۔ تیل کھانا پکانے کے برتن۔ ڈالڈا کے ڈبے ساتھ ہی دو حلوائی بھی لیتا آیا تھا۔ اس کے آتے ہی بڑے بڑے چولہوں پر کڑھاؤ چڑھ گئے۔ اور پوریاں بنائی جانے لگیں۔ آلو اور ساگ کی بھاجی تیار ہونے لگی۔ دوسری طرف امیر لوگوں کے لئے مرغ۔ ماہی کا ... ہونے لگا۔ اسپیشل تھال پانچ روپے میں، امیروں، غریبوں کے لئے تیل کی پوریاں۔ دو آنے کی ایک پوری اور

ایک آنے کی بھاجی ۔ !
گرما گرم مزے دار
چٹپٹی چٹنی ۔
سوندھی سوندھی آلو کی بھاجی ۔

لوگ کھوک سے تو بے تاب ہی تھے ۔ دھڑا دھڑ خریدنے لگے۔ شروع شروع میں یہاں بھی پانی کی طرح ہلا ہوا لیکن لوگ بہت جلد سمجھ گئے ۔ اور کیو باندھ کر کھانا کھانے لگے۔ کیونکہ دکان صرف ایک تھی

حاجی عیسیٰ نے ہاتھ مل کے مولوی سے کہا ۔ دیکھا سنہار تو کیسے دونوں ہاتھوں سے روپیہ بٹور رہا ہے۔"

مولوی نے حاجی عیسیٰ کے کان میں کچھ کہا۔ حاجی عیسیٰ اس کی بات سن کر مسکرایا۔ اور تھوڑی دیر کھسر پھسر کرنے کے بعد دونوں پوتی لال کے پاس پہنچے

"السلام علیکم" مولوی نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

رام رام پوتی بھائی" حاجی عیسیٰ نے کھانس کر کہا

پوتی لال کا ماتھا ٹھنکا۔ مگر اس نے اپنے حواس بجا رکھے۔ بولا۔ آؤ۔ آؤ۔ سیٹھ بیٹھو۔"

پوتی لال نے ان دونوں کو اپنے بستر پر جگہ دی ۔ دونوں پاس پاس پوتی لال کے قریب بیٹھ گئے ۔ حاجی عیسیٰ نے گفتگو شروع کی "کمائی بڑے زوروں پر ہے ۔ خوب کما کھاؤ گے سیٹھ ۔"

"بھگوان کی کرپا ہے" سیٹھ پونی لال نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر
مولوی نے داڑھی پہ ہاتھ پھیر کر کہا "انشاء اللہ انشاء اللہ"
حاجی عیسے نے مولوی کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ مولوی انشاء اللہ ہیں۔ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ہماری قوم میں ان کی بڑی عزت ہے"

سیٹھ پونی لال نے مولوی کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے۔

"حاجی عیسے بولے مولوی صاحب فرماتے ہیں اس گاڑی میں زیادہ نہیں تو کم از کم چار سو تو مسلمان ہونگے۔ انہیں کافروں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے پر ضرور اعتراض ہوگا۔"

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے دکان تو ایک ہے نہیں کھائیں گے تو بھوکے مر جائیں گے۔

"مارنے والا اور جان بخشنے والا اللہ ہے کسی کافر کی یہ کیا مجال ہے کہ وہ کسی مومن کو مار سکے!!!" مولوی صاحب نے گرج کے کہا۔

پونی لال کانپ گیا۔

حاجی عیسے نے کہا۔ اگر مولوی صاحب ابھی ایک فتویٰ دے دیں، مومن مسلمان مرد مجاہد مر جائیگا۔ مگر تمہاری دکان پر کبھی نہیں آئیگا۔

پونی لال چپ رہا۔ دیر تک حاجی عیسے اور مولوی صاحب کو گھورتا رہا حاجی عیسے اپنی بکری نما داڑھی کھجلاتا رہا۔ مولوی صاحب آنکھیں پھیر کر خلا میں دیکھتے رہے۔ آخر پونی لال بولا۔

"تم چاہتے کیا ہو۔؟"

"ہم اپنا حصہ چاہتے ہیں۔"

"حصہ ——؟"

"ہاں حصہ!" مولوی نے گرج کر کہا۔ "ورنہ —— فتویٰ!"

"میں سمجھا نہیں" پونی لال بولا "کیا حصہ؟"

حاجی عیسےٰ نے کہا "پونی لال تم اتنے بھولے نہیں ہو۔ بہرحال اب تمہیں سمجھانا ہے۔ تو سمجھانا ہی پڑے گا۔ سنو! ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے سامان کا آدھا حصہ ہمیں دے دو۔ اس میں سے ہم ایک دکان کریں گے مسلمان بھائیوں کے لئے روٹی اور سالن فراہم کریں گے سامان تمہارا ہوگا دکان داری ہماری ہوگی۔ منافع آدھا آدھا۔ بولا۔ منظور ہے؟"

مولوی نے کہا۔ جلدی بولو۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔"

پونی لال بولا "تین چار سو آدمیوں کے لئے تمہیں آدھا منافع دینا غلط ہوگا۔ آٹھواں حصہ لے لو۔"

"غلط" مولوی بولا۔

"چھٹا حصہ" پونی لال سودا کرنے لگا۔

"غلط" حاجی عیسےٰ نے پھر انکار میں سر ہلا کر کہا۔

آخر بڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ پونی لال اپنے سامان میں سے مرغ و ماہی۔ انڈے۔ آٹا وغیرہ سب کچھ دے گا حاجی عیسےٰ اپنی دکان الگ کریں گے اس میں جو منافع ہوگا۔ اس میں سے ایک چوتھائی حصہ پونی لال کا ہوگا اور تین چوتھائی حاجی عیسےٰ کو اور پونی لال کی دکان سے حاجی عیسےٰ کو کچھ نہیں ملیگا۔

۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسرے ٹیلے پر حاجی عیلے کی اسلامی دکان کھل گئی ۔ گوشت روٹی مرغ پلاؤ ملنے لگا ۔

برتنوں کے ساتھ ساتھ پہلوانوں کا بھی بٹوارہ ہوا ۔ اور تین پہلوان حاجی عیلے کے حصوں میں آئے کچھ حاجی عیسے نے تھرڈ کلاس میں چھپن چن کے اسی طرح نکالے جس طرح پوتی لال نے فراہم کیے تھے ۔

پہلوان آوازیں دینے لگے ——

" حاجی عیلے کی سلامی دکان —— "

" گوشت "

" بوٹی کباب ۔ "

" شامی کباب "

" مرغ "

" پلاؤ ۔ "

" بریانی "

" روٹی گوشت "

" آ بیٹھے آ بیٹھے برادرانِ اسلام ! "

" سستا مال لگا دیا ہے دو آنے میں گوشت اور روٹی ۔ صرف دو آنے میں —— گوشت اور روٹی ۔ "

نہہ بندر نے جمال بوانگریز سے کہا ۔ " اب تو تمہارے بھی مزے ہو گئے ۔ الگ اسلامی دکان کھل گئی — "

جمال نے غصے سے کہا "کس بات کے مزے ہو گئے۔ گدھے ہو تم۔ مجھے تو حاجی علیسے اور سیٹھ پونی لال میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔"

نریندر نے کہا۔ بہت فرق ہے۔ ایک کا نام پونی لال ہے اور دوسرے کا حاجی علیسی۔ اسی سے فرق سمجھ جاؤ۔"

جمال بولا "نام الگ الگ ہیں۔ دکانیں الگ الگ ہیں۔ مندر اور مسجد الگ الگ ہیں۔ لیکن دونوں کا بینک ایک ہے۔"

نریندر بڑی حیرت سے جمال کی طرف دیکھنے لگا جمال جو ایک معمولی فرد در تھا ایک مل میں پوائنٹ مین تھا۔ جو بہت پڑھا لکھا بھی نہ تھا جس کے بارے میں نریندر کا خیال تھا۔ ایک سیدھا سادھا اکھڑ مزاج مسلمان ہے۔ بلکہ نریندر کو محسوس ہوا کہ جمال ان معاملوں میں اس سے کہیں گہری نظر رکھتا ہے۔

جمال اپنی بات کہہ کے پلٹا اور پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ جہاں چوٹی سے اوپر بجلی کھڑی تھی۔

نریندر نے اس سے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

"کچھ کھودنے جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو گے؟"

جمال پہاڑی کے اوپر چڑھنے لگا مگر نریندر نیم کے پیڑ کی جانب مڑ گیا۔ جہاں اجکاری بیٹھی تھی۔

* * * * * * *

تیرھواں باب

آسمان کے غربی افق سے شفق کی آخری سرخ بوند بھی چھن گئی اور اب آسمان بڑا بدہیبت۔ سبز اور سیاہ کائی کے رنگ ایسا نظر آنے لگا۔ راجکماری نیم کے تلے ریت میں انگلیاں گھمانے گھماتے بولی۔

"لوگ کنتک کہتے ہیں۔"

میں سمجھتی تھی اور بچپن ہی سے میرے ذہن میں چوروں اور ڈاکوؤں کے متعلق یہ خیال تھا۔ کہ وہ بڑے وحشی خوفناک اور جانوروں کی طرح ہوتے ہونگے۔ مگر تم تو......"

"میں سمجھتی تھی کہ چور دوسری طرح کے ہوتے ہوں گے۔ مگر......"

"نہیں۔ بلکہ۔ چور ہماری طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ ہم میں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے حالات انہیں چور بناتے ہیں۔ ہماری اپنی پولیس انہیں ہتھکڑی پہناتی ہے غلام رسول سے پوچھ لو۔ یہ پولیس میں ہے میں چور ہوں لیکن اگر حالات ذرا مختلف ہوتے تو وہ چور ہو سکتا تھا اور میں پولیس میں ....."

"مگر۔ میں ـــــ نہ جانے کیوں۔ میرا دل باور نہیں کرتا کہ تم چور ہو۔"

"اس کی ایک وجہ ہے نریندر نے مسکراتے ہوئے کہا

راجکماری کے کانوں پہ حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ بڑی کمزور آواز میں بولی۔

"کیا ـــــ؟"

"کیونکہ میں تمہارے باپ کا رشتے دار ہوں۔"

"سچ؟" راجکماری کے اختیار چلا اٹھی۔

"ہاں۔ میں اس کا چھوٹا بھائی ہوں۔"

"وہ کیسے؟" راجکماری بڑی حیرت سے بولی۔

"وہ اس طرح کہ وہ بڑا چور ہے۔ میں چھوٹا چور ہوں۔ میں ایک آدمی کو لوٹتا ہوں۔ وہ اسی لاکھ آدمیوں کو لوٹتا ہے۔"

"شیٹ اپ"

"میرے پاس ایک پستول ہوتا ہے۔ اس کے پاس اسی ہزار پستول گنیں۔ ٹینک اور ہوائی جہاز ہوتے ہیں وہ خندقوں کے پیچھے اپنی فوج اور پولیس کی حفاظت میں رہتا ہے اور میں اکیلا رات کی تاریکی میں ایک بھوکے بھیڑیے کی طرح شکار کی تلاش میں نکلتا ہوں اور پکڑے جانے پر جیل میں جاتا ہوں یا گولی کا شکار

ہو جاتا کیوں؟" "رہنے دو۔"

"جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ اسی طرح بڑا چور چھوٹے چور کو کھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم محل میں رہتی ہو اور میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ہے۔"

"تم بڑے بدتمیز ہو جی۔ میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔" راجکماری اس کی طرف پیٹھ موڑ کے بیٹھ گئی۔

نریندر کو بڑا مزہ آیا۔ اس نے راجکماری کے شانے پکڑ کر پھر اپنی طرف گھما دیا۔

"آج تو تمہیں میری باتیں سننا پڑیں گی۔ بلو۔ ذرا سوچو تو آج تم کیسی بےکس بنی ہو۔ اکیلی ہو راجکماری۔ راجہ کی بیٹی۔ مگر راجہ سے اس کی طاقت چھین لو تو راجہ کیا ہے اس کی راجکماری کیا ہے۔ ریت پر بیٹھی ہوئی ایک مجبور لڑکی۔ تم اپنی فوج اور پولیس محل اور دولت اور دولت کے خوشامدیوں کے لاؤ لشکر کے بغیر کیا ہو۔ راجکماری! کیا تمہیں اسکول میں کسی استاد نے یہ بات بتائی تھی نہیں بتائی ہوگی ورنہ وہ اب تک کب کا اسکول سے نکالا گیا ہوتا۔ عجیب بات ہے، راجکماری۔ تمہارے راج میں ہم چھوٹے چور کو تو چور کہہ سکتے ہیں لیکن بڑے چور کو راجہ کہنے پر مجبور ہیں، ذرا غور تو کرو راجکماری۔ یہ معاملہ کس قدر دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ آج ایک بڑے چور کی بیٹی ایک چھوٹے چور سے یوں برابری کی سطح پر مل رہی ہے۔ اسی بات پر ہاتھ ملا دو۔ بلو۔"

مگر راجکماری نے ہاتھ نہیں ملایا۔ نریندر ہنسنے لگا۔ اتنے میں اس نے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ گھوم کے دیکھا۔ ڈاکٹر کا منہ تھا۔ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا۔ بلکہ تقریباً بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح

[illegible] سی تھی

[illegible] ہوا؟ ریلیف ٹرین آگئی؟ نریندر نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر کا منھ جلدی جلدی بولا۔ وہ —— وہ جو فقیرنی ہے۔ جس نے بچہ جنا ہے۔ اس کی حالت غیر ہے"

"کس کی؟ بچے کی؟"

"نہیں" ڈاکٹر کا منھ نے بڑی بے تابی سے سر ہلایا۔ بچے کی نہیں ماں کی مجھے کسی سے تھوڑی سی برانڈی دلوا دو"

"برانڈی میں کہاں سے لاؤں" نریندر نے ڈاکٹر سے کہا۔ پھر راجکماری کی طرف مڑ کر کہنے لگا، "راجکماری کا نشاہی بار غریب ہوتا تو راجکماری سے مانگ کر تمہیں —— دیتا۔ مگر اب کہاں سے لاؤں گا؟"

راج . ری نے غصے سے نریندر کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹ چبانے لگی کا منھ [illegible] کہا۔

"یہ وقت مذاق کا نہیں ہے۔ برانڈی مل جائے تو ممکن ہے اس کی جان بچ جائے۔ فقیرنی کو زائد سردی لگ گئی ہے۔ اگر ماں نہیں بچی تو ایک ... ن کا بچہ ہاہی نہ بچے گا؟"

نریندر نے بے بس ہو کے کہا، "تو میں اب اس میں کیا کر سکتا ہوں ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر کا منھ بولا، "تم میرے ساتھ چلو۔ لوگ تمہاری بات مانتے ہیں وہ جو پہلوان ہے نا ایک فقیرا۔ اس کے پاس سنا ہے - برانڈی ہے۔"

"چلو۔ اس کے پاس چلتے ہیں۔"

ڈاکٹر کامتھ اور نریندر دونوں حاجی عیسٰے کی دکان پر پہنچے۔ جہاں فقیر اور اس کا بڈھا معراج بیٹھے پہرہ دے رہے تھے۔ نریندر نے فقیر سے پوچھا استاد! سنا ہے تمہارے پاس برانڈی ہے؟

"ہے نہیں تھی۔" معراج بولا۔

"پی ڈالی؟" نریندر نے مایوسی سے پوچھا۔

"پی ڈالی نہیں۔ پینے کے لئے بیچ دی" فقیر نے اپنے گورے چہرے پر ایک روشن سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔ سو روپیوں میں برانڈی کی بوتل بیچ ڈالی۔ بڑا سودا نہیں رہا۔ اتنے دام تو برانڈی کے بمبئی میں بھی نہیں اٹھتے جہاں شراب بندی ہے۔"

ڈاکٹر کامتھ نے کہا کسے بیچی ہے۔؟"

معراج نے ہاتھ اٹھا کے پہاڑی پر کھڑی سنگ سرخ کی چوبرجی کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں وہ لوگ بیٹھے پی رہے تھے۔"

چوبرجی کے نیچے الاؤ کی روشنی میں بخار آلود چہرے جھلملا رہے تھے۔ کبھی تاریکی میں چھپ جاتے کبھی یکایک روشن ہو جاتے۔

کھنہ نے کہا "یار چھگن یہ برانڈی اس وقت مزہ دے گئی۔"

چھگن بولا "اور کیا چاہیئے اس وقت جام ہے ہرن کا کباب ہے ہرن کی آنکھوں والی شکنتلا ہے۔"

"کیوں شکنتلا ڈارلنگ پیو گی نا۔"

ایک سندھی ناجر بولا "سب کچھ ہے۔ شراب بھی ہے عورت بھی

شعر بھی مگر موسیقی نہیں ہے۔ کہیں سے اس وقت ایک ریڈیو

اے میرے یار" دلیپ سائیں جھومتے ہوئے بولا

ہوا اپنا یار زخمی تو موجود ہے زخمی شاعر ایک پھڑکتی

ہوئی غزل ہو جائے

"غزل کہو" زخمی نے بے حد سنجیدہ ہو کے کہا۔

"اچھا گجل نہیں۔ غ۔غ غجل غجل سنا دو۔"

"غجل نہیں غزل کہو"۔ زخمی نے پھر دہرایا۔

"گزل ؟ گزل ! ہاہاہا۔ اب تو ٹھیک کہہ دیا۔ بڑے بھائی۔ اب تو سناؤ

نرملا تم ذرا کہو نا اس سے شاعر ہے۔ عورت کی بات منتا ہے۔"

پڑے۔ نرملا نے بھی فرمائش کر دی زخمی نے ایک گھونٹ پیا

[illegible] اور غزل سنانے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر غزل تھی نگاہیں نرملا کی نگاہوں

الجھی تھیں اور وہ یکایک سب کچھ بھول گیا۔ کہ وہ کہاں بیٹھا ہے کیوں

بیٹھا ہے کیوں [illegible] الاؤ میں چمکتی ہوئی دو آنکھیں نظر آئیں

[illegible] ڈوب گیا اور دھیرے دھیرے گانے لگا اور آہستہ آہستہ اس کی آواز مدھم ہوتی گئی

[illegible] نیچے موت کی وادی میں گاڑی الٹی پڑی تھی اور لوگ خوف زدہ

[illegible] میں دبکے پڑے تھے۔ وہ بھوکے تھے ننگے تھے زخمی تھے۔

[illegible] کر رہے تھے۔ جنگلی جھاڑیوں میں ہوا کا جھونکا کبھی کبھی کسی چڑیل کی

طرح [illegible] گزر جاتا [illegible] ہوتا۔ [illegible] تو

چینا کرا تھے۔ مگر یہ تو ہوا تھی کہ وہم تھا کہ موت کا سایہ تھا جو بے پاؤں ان کے قریب
قریب اور قریب اور قریب آج لوگ بہت بے بس اور مجبور تھے انہوں نے
قیمت ادا کی تھی اور کھانے کی قیمت ادا کی تھی۔ اور ہر قیمت ادا کی
پر زندہ رہنا چاہتے تھے۔ آج ان کے کان ریل کی
کی دھمک سننے کیلئے بے قرار تھے۔ کب آئیگی وہ ریلیف ٹرین
جیسے موت کھوک ورنا امیدی سے نجات دے گی مگر ابھی تک
نہیں ہے چاروں طرف سناٹا ہے فضا خاموش ہے کان بھی نہیں
پر سے لیے پڑے ہیں گارڈ والا کے پاس اکیلا بیٹھا ہے غلام رسول بندوق اٹھائے
پہرہ دے رہا ہے ایک فقیرنی بے ہوش پڑی ہے ایک بچہ رو رہا ہے اور ان
اوپر چوپر جی سے نہ وہ غزل گونج رہی ہے ہوا میں ایک سیاہ جھنڈے کی طرح لہرا رہی
ہے اس سیاہ جھنڈے پر انسانی کھوپڑی کا اور ہڈیوں کا نشان ہے
یا بحری ڈاکوؤں کا جھنڈا ہے۔ اس کا ہر مصرع بل کھاتے ہوئے سانپ کی طرح
لہرا رہا ہے۔

نریندر نے چوپرجی کے اندر آکے پوچھا کہ آپ لوگ تھوڑی برانڈی دیں گے؟"
کھنہ نے بڑی حقارت سے نریندر کی طرف دیکھا اور کہا "یہ برانڈی ہم نے خرید کر
حاصل کی ہے بسوار دینے کا ہر الوٹ دیا ہے کسی کے گھر چوری نہیں کی ہے
ڈاکٹر کامتھ نے کہا "وہ فقیرنی بیمار ہے اسے سردی لگ گئی ہے۔"
"ہمیں بھی سردی لگ رہی ہے" ڈاکٹر چھگن بولا۔
سب ہنس پڑے۔

"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے" ڈاکٹر کا منھ ذرا غصے میں بولا۔ "برانڈی کے
گھونٹ سے شاید اسکی جان بچ جائے وہ غریب بچنے والی ہے۔
گھونٹ مانگتے ہو یہاں ایک بوند نہیں ملی گی" دلیپ بائی نے فیصلہ کن
پیپے ... سے لگا لیا۔

ایک بوند محبت کی ایک بوند۔ زندگی کی ایک بوند۔ اس
جو اس قدر خشک کیوں ہے یہ ریگستان اتنا بڑا کیوں؟
ہے یہ ریت کے ٹیلے اتنے اونچے کیوں ہیں۔ یہ آسمان اسقدر خالی کیوں ہے
کہاں ہے وہ سپید قلعہ ابد افق کے کس گوشے میں وہ اس مقدس گنگا کو چھپائے
بیٹھا ہے کہ جسے نریندر اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زمین پر ایک ندی کی طرح
اتار لینا چاہتا ہے تاکہ اس وسیع اور بے کراں ولامحدود ریت کا ذرہ ذرہ اس
پانی سے سیراب ہو جائے۔

نریندر نے حسرت اور مایوسی سے ان آدمیوں کی طرف دیکھا ان میں مرد بھی
تھے، عورتیں بھی اور ایک شاعر بھی تھا۔ جو بیک وقت مرد بھی تھا اور عورت
بھی اور اپنے سینے میں حسن اور عشق دونوں کا احساس رکھتا تھا کیا سچ مچ رکھتا
تھا نریندر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"صرف ایک گھونٹ برانڈی چاہیئے۔"

"میرا گلاس خالی ہے" شاعر نے اپنا خالی گلاس اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا۔
"اس کا جام بھر دو جی" کھنہ دلیپ بائی کی طرف دیکھ کر بولا۔
دلیپ بائی نے برانڈی کو گلاس میں ڈالنا شروع کیا نریندر نے اپنے ہاتھ اپنے سینے

پر بابا نے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔
ڈاکٹر کامتھ نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا "
نہیں" نریندر رک گیا۔
شراب کا سنہری سیّال گلاسوں میں چھلکا۔ وہ قلقل کرتا
ناچنے والی گرمی آن واحد میں رگ و پے میں سما گئی۔ آ
اور کبھی پیاسے نظر آنے لگے بوتل خالی ہو گئی۔ دیسائی نے
ایک لمحے کے لئے سرسراتا ہوا نیلا شعلہ بلند ہوا شراب
بوتل خالی تھی۔ دیسائی نے خالی بوتل نریندر کی طرف پھینک
ہاتھوں سے اُسے بے اختیار اچک لیا وہ دیر تک اس خالی بوتل
چہروں کو جو خالی بوتلوں سے زیادہ خالی تھے۔ یکایک اس نے اٹھا کر
زمین پر پٹخ مارا۔ اور منہ موڑ کر ڈاکٹر کے ساتھ واپس چلا گیا۔ بوتل ایک
سے ٹوٹ گئی بس شیشہ ہی تو تھا۔ نیچے وادی میں ایک ماں اپنے آخری سانس کے
ساتھ کراہی۔ اور پھر خاموش ہو گئی۔ ایک جسم ہی تو تھا اس کا بچہ مردہ چھاتیوں سے
ڈھلک کر ریت پر آ رہا اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دودھ تلاش کرنے
لگا۔ ایک بچہ ہی تو تھا۔
نریندر نے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور بلکتے ہوئے کو لے چلا
ماں اسے اپنے آغوش میں لے گی اپنی چھاتی سے لگائے گی اپنی گود میں سلائے گی۔ یہ
بھکارن کا بچہ بے ماں باپ کا یتیم اور لاوارث بچہ ایک دن کا سہما سہما سا پھول
کون لے گا۔ عورتیں تو بہت ہیں۔ مگر آج دیکھنا ہے ماں کون ہے راجکماری وہ منسا

اور راجکماری کے سامنے سے بچہ اٹھائے ہوئے گزر گیا۔ یہ مینک کی بیوی تھا۔ سوداگر اپنے خاوند کے غم میں کھوئی ہوئی بیوہ۔ "یہ بچہ لو گی؟ نریندر نے پوچھا۔ مینک کی بیوی نے انکار میں سر ہلا دیا۔
" یہ کالا ہے"

نریندر آگے بڑھ گیا۔ وہ تین ٹولیوں میں گھوما لیکن کسی نے ایک بھکارن کے بچے کو گود میں لینے کی حامی نہیں بھری

سیٹھ لیہ کی لال سیٹھانی نے کہا "ہائے ہائے یہ معصوم سا پھول میں اسے گود میں نہیں لے سکتی مگر تم اس کے لئے یہ سو روپیہ لے جاؤ۔ یتیم خانے میں داخل کرا دینا۔

نریندر نے سو کا نوٹ واپس کر دیا۔ "اسے ایک ماں کی ضرورت ہے۔ یتیم خانے کی نہیں۔ دودھ کی ضرورت ہے کاغذ کے ٹکڑے کی نہیں۔"

پھر وہ اور دو تین ٹولیوں میں گھوما ہر ایک نے انکار کر دیا ہر ایک ہمدردی جتاتا تھا لیکن کوئی گود میں لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ آخر کار وہ پنڈت جی کی بیوی کے پاس گیا۔ پنڈت جی کی بیوی کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا اسکی لڑکی کو نریندر نے بچایا تھا۔ وہ اگر اس کی ماں بن جائے اسے اپنی چھاتیوں کا دودھ دے دے تو اس بچے کی جان بچ سکتی ہے۔"

پنڈت جی نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے تم نے ہماری بچی کی جان بچائی ہے۔ تم ہماری جان لے لو مگر ہمارا دھرم تو نہ لو۔ نریندر کھیائی میں ہندو ہوں برہمن ہوں۔ یہ بھکارن کا بچہ ہے۔ اسکی ذات معلوم ہے نہ گوت نہ ماں نہ باپ۔

میں اپنی آنکھیں رکھتے ہوئے کیسے جلتی آگ میں کود پڑوں! اپنا دھرم بھرشٹ کر لوں، یہ ہم سے نہ ہو گا۔ نریندر بھائی آگے جاؤ، کسی اور سے سہایتا کرو"

بہت سی جگہوں سے مایوس ہو کر نریندر لوٹ کر ناجدین لوہار کی کوٹھی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ "ناجدین کی جیون بیوی اپنے خاوند کے پاؤں دبا رہی تھی۔

"تم کیا کہتی ہو؟" ناجدین نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

ناجدین کی بیوی نے بلبلاتے بلکتے ہوئے بدصورت منے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"مگر —"

ناجدین نے کہا۔ نہیں بھائی۔ میری بیوی نہیں چاہتی"

حمیدہ جمال کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ میں اسے لے لوں گی"

مگر لوگ کیا کہیں گے۔ ابھی ہماری تمہاری شادی نہیں ہوئی"

جمال مسکراتے ہوئے بولا

"کچھ بھی کہیں لاؤ بچہ مجھے دو۔"

"مگر بچہ تو میں نے لے لیا" ناجدین کی بیوی حمیدہ کو روک کر منے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ اس نے بچے کو لے کر اپنی گود میں چھپا لیا۔

"تم تو بچہ چاہتی تھیں" ناجدین حیرت سے بولا۔

"میں نے کچھ اور کہا تھا" ناجدین لوہار کی بیوی آہستہ سے نظر جھکائے ہوئے بولی۔

"کیا —؟"

تاجدین کی بیوی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے حمیدہ کے کان میں کچھ کہا۔ حمیدہ مسکرا پڑی، ہنس کر اپڑی۔

"یہ کہتی ہے بچہ تو لے لیا اسے دودھ کہاں سے دوں گی ہے۔"

تاجدین شرمندہ ہو گیا" بولا۔ میں نے تجھے غلط سمجھا تھا مجھے معاف کر دے۔ ۔۔۔۔ ؟"

"دودھ کہاں سے ملے گا ؟ نرپندر پریشانی سے بولا

کہاں سے ملے گا اس صحرا میں اب سوچاؤ اس کے منہ میں ذرہ ذرا پانی ٹپکاتے رہیں گے۔ شاید صبح تک ریلیف ٹرین آجائے اور یہ بچہ بچ جائے۔"

دودھ ۔۔۔ دودھ ۔۔۔۔ کہاں سے ملے گا۔ ؟

نرپندر اور کامتھ پریشان ہو کر چاروں طرف مختلف ٹولیوں میں ڈھونڈتے پھرے مگر دودھ کس کے پاس تھا۔ اور واقعی کسی پاس نہیں تھا۔ ورنہ ممکن تھا۔ کوئی دے دیتا آخر تھک کر اور پریشان ہو کر اور بالکل ناامید ہو کر نرپندر واپس لوہار کی ٹولی کے پاس چلا گیا بچہ بھوک سے بے تاب تھا۔ اور بلک بلک کر رو رہا اور رات کے سناٹے میں اس کی بے لبز مجبور آواز ایک مایوس سوال کی طرح گونج رہی تھی۔

"دھواں ۔۔ ۔ دھواں ۔۔۔۔ دھواں ۔۔۔" اب تو یہ پانی نہیں پیتا بس روئے جاتا ہے" تاجدین کی بیوی نے بڑی مایوسی سے کہا۔

بچے کی آواز لمحہ بہ لمحہ کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے چراغ بجھ رہا ہو۔

رات کا وقت۔ مکمل سناٹا۔ ایسا مکمل مایوسی۔ سب سو رہے تھے۔

یکایک نریندر کو قدموں کی چاپ سنائی دی ایک عورت دبے پاؤں کہیں سے چلتے ہوئے آئی تھی اور آتے ہی زمین پر تاجدین کی بیوی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اور ہانپتے ہوئے سرگوشی میں بولی بچہ مجھے دو۔ میں اسے دودھ پلا دوں گی۔

اور کسی کا انتظار کئے بغیر اس عورت نے بچے کو اٹھا کے اپنی گود میں ڈال لیا۔ اور جلدی سے اپنی قمیص کو اوپر کر کے چھاتی نکالنے لگی

نریندر نے دیکھا۔ یہ پنڈت جی کی بیوی تھی وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی اور بار بار پریشانی سے ادھر ادھر دیکھتی جاتی تھی اور کہہ رہی تھی وہ سو گئے ہیں آئی۔ جب وہ جاگتے رہے میں نہیں آسکی نہیں آسکتی تھی اس کا بلکنا سن رہی تھی۔ مگر نہیں آسکتی تھی میں کب سے آنا چاہتی تھی۔ مگر نہیں آسکتی تھی کیونکہ ہم براہمن ہیں اور اس نے جلدی سے فقرہ نامکمل چھوڑ کے قمیص اوپر کر کے چھاتی نکال کے بچے کے منہ میں دے دی۔ اور بچہ ٹھہر کے سسک کے دودھ پینے لگا

اور پنڈت کی بیوی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے زور سے بچے کو اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ اور نریندر کی آنکھوں سے تاجدین کی آنکھوں سے جمال کی آنکھوں سے اور حمید کی آنکھوں سے نرمل نرمل آنسوؤں کی طرح بہہ رہی ہے

سوتے ہوئے پنڈت کی بیوی لوری گانے لگی۔ سہارے بڑے تاجدین کی بیوی۔

نبیزی اور حمیدہ اس لوری میں شریک ہوتی گیئں۔ ہوتے ہوتے زبیدہ کو محسوس ہونے لگا۔ جیسے ان چھوٹے چھوٹے لوگوں کے درمیان سب کچھ ہے۔ یہاں گنگا بھی ہے اور سپنا بھی یہاں ناہنا بھی ہے اور محبت بھی یہاں زندگی بھی ہے۔ اور حسن بھی۔ نغمہ بھی ہے اور خوشبو بھی اور یہاں امید کا وہ چراغ ہے۔ جو بڑی بڑی تاریکیوں کو روشن کر دیتا ہے۔

چودھواں باب

تاجدین اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھے ہوئے آنکھوں پر سایہ کئے ہوئے سیٹھ بوٹی لال کے ٹیلے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جدھر سے اس کی بیوی بانو کی آ رہی تھی۔ تاجدین نے گردن اونچی کر کے آسمان کی طرف نگاہ ڈالی۔ آگ کھولتے ہوئے لاوے کی طرح گرم اور تانبے کی طرح سرخ نظر آتا تھا سورج تند خو اور شعلہ ریز۔ تیز اور آبی ادھ جلا سا دینے والا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان سے کرنیں نہیں۔ چنگاریاں برس رہی ہیں۔

تاجدین نے آس پاس کی روکھی سوکھی خاکستری جھاڑیوں اور درختوں پر نظر دوڑائی۔ یہ درخت اور جھاڑیاں صحرا کی پیداوار تھی۔ اس لئے یہ گنیا سورج کی تیز حرارت کو برداشت کر لیتی تھیں ان کی جڑیں ان کے پتے

ان کی چھال، ان کی ساخت کا ہر رگ و ریشہ لاکھوں برس کی مدافعت کے بعد اس صحرائی حدت کی تیزی اور بلاخیزی کو برداشت کرنے کا عادی ہو گیا تھا ان درختوں اور ان جھاڑیوں کو بھی پیاس لگی ہو گی کس طرح ریت کے نیچے ہی نیچے زمین کی گہری تہوں میں انکی جڑوں کے رگ و ریشے پانی کی ایک بوند تلاش کرتے ہونگے۔ پانی زندگی کے لئے کس قدر ضروری ہے اور وہ ہوتی لال کا بچہ اس پر بھی محصول لگائے بیٹھا ہے۔ ناجدین کی بیوی اس کے قریب آکے اسے پانی دینے لگی۔ ناجدین نے پانی پینے سے پہلے رک کر پوچھا "مگر پانی تم کیسے لے آئیں۔ پیسے تو ختم ہو چکے"

"پیسے تو نہیں تھے مگر کان کی بالیاں تو تھیں۔"

جب ناجدین نے اپنی بیوی کے کانوں میں چاندی کی بالیاں نہ دیکھیں تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا قریب تھا کہ وہ ہاتھ کے ایک جھٹکے سے پانی کو ریت پر گرا دے۔ مگر اس کی بیوی نے جلدی سے پانی کا برتن پیچھے ہٹا لیا۔ "لو آج ہے۔ سونے سے بھی قیمتی ہے ہمیں پتہ نہیں جانے کب تک گاڑی کا انتظار کرنا پڑے۔ لو پانی پی لو"

ناجدین کی بیوی کا حلق خشک ہو رہا تھا اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور اس سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔ ناجدین نے بڑے پیار سے کہا "نہیں پہلے تم پی لو۔"

"پہلے تم پیو نا!" اس کی بیوی نے آہستہ سے کہا اور ناجدین اس کے ہاتھ سے برتن لے کر پینے لگا۔

ناجدین نے پانی کا برتن اپنے منہ سے لگا لیا۔ اور بے اختیار غٹا غٹ

پانی پینے لگا۔ پانی پیتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جسم کے اندر جلتی ہوئی ریت بھر دی تھی۔ اور وہ اس وقت شاید پوری نہ پی سکتا تھا۔ پانی کا برتن منہ سے لگاتے وقت اسے کچھ اس قسم کا احساس تھا کہ پانی بہت کم ہے۔ اور پیاس بہت زیادہ ہے۔ حدت بہت زیادہ ہے اور پانی کی ٹھنڈک بہت کم ہے۔ یکایک اس کی نگاہیں حمیدہ کی پیاسی نگاہوں سے جا ملیں۔ اور وہ پانی پینے پیتے رک گیا اور پانی کا برتن اپنے ہونٹوں سے ہٹا کر بیوی کے حوالے کر کے کہنے لگا

"لو باقی پانی تم دونوں پی لو۔"

باقی پانی پہلے تاج دین کی بیوی نے پیا۔ دو گھونٹ پی کے اس نے برتن حمیدہ کے حوالے کر دیا۔ حمیدہ نے کہا۔

"تھوڑا سا پانی اور لو نا"

تاج دین کی بیوی نے انکار میں سر ہلایا۔

حمیدہ تاج دین کی بیوی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پانی کا برتن اس کے ہاتھ میں تھا۔ پانی ابھی اس نے پیا بھی نہیں تھا۔ کہ یکایک ایک ہاتھ سے اس نے پانی کا برتن چھین لیا۔ اور اس سے پیشتر کہ وہ چلا سکتی۔ یا پانی کا برتن واپس چھین سکتی اس نے دیکھا کہ پانی کا برتن ایک بھوکے پیاسے منہ سے ایک چھوٹے سے حلق سے پانی غٹا غٹ نیچے جا رہا ہے پانی کے برتن کے اوپر دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں ایک وحشیانہ انداز میں چمک رہی ہیں۔ حمیدہ ان کی وحشیانہ چمک میں کھو گئی۔ بالکل جانوروں کی طرح آنکھیں تھیں وحشی پیاسی

ولیس، خوفناک دیدے باہر نکلے ہوئے۔ پتلیاں ساکن پلکیں ساکت پھر
یوں جیوں پانی اندر اتر تا گیا۔ ان آنکھوں میں نرمی آتی گئی۔ ان کی وحشیانہ چمک ختم
ہوتی گئی۔ دیدے اندر جانے لگے پتلیاں حرکت میں آنے لگیں۔ پلکیں ہلنے لگیں
پھر بزنس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے زمین پر گر گیا۔ اور اب یہ ایک جانور
ہی نہیں۔ ایک انسان کی آنکھیں تھیں ایک خوفزدہ بچے کی آنکھیں جو یکایک
سے پلٹ کر پھر سماج میں آ گیا تھا۔ اور حیرت، پریشانی، ڈر اور جرم
جیسے احساس سے حمیدہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حمیدہ نے اپنے سوکھے ہوئے
ل پر زبان پھیری۔ اور منہ موڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے برتن
تن ریت پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ وہ سندھی لڑکا جس نے اس سے برتن
۔ اب اپنے دونوں ہاتھ لٹکائے اس کے سامنے کھڑا کانپ رہا تھا
پھر یکایک وہ پلٹا اور جلدی سے ٹیلوں کی طرف بھاگ گیا۔
ناحدین کا جسم تھر تھر غصے سے کانپنے لگا۔ وہ اپنے سونٹے کا سہارا
لے کر کھڑا ہوا - اور بولا
" اس سور کے بچے لوتی لال کو ابھی جان سے مار دونگا۔ "
س کی بیوی نے اسے پکڑ لیا۔
" یہ کیا بدمعاشی ہے۔ یہاں لوگ پیاسے مر رہے ہیں اور وہ پانی
رہا ہے۔
غصے سے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک ناٹے قد۔ بھاری جسم کا آدمی
کونے جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اور جس کی کھچڑی داڑھی کتنی نورانی تھی

سُرخ تھی۔ اور بال الجھے ہوئے اور گردن بے حد میلی کچیلی تھی۔ اپنی جگہ سے اکھڑ کے تاج دین کے قریب آیا۔ اور اپنا گھونسا اٹھا کر بولا تم اچلو میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ!"

تاج دین اس کی طرف غور سے دیکھا۔

ناٹے قد کے آدمی نے ریت پر زور سے تھوک کر کہا۔ میرا نام بہاری ہے میں دربار واڑہ میں پتھروں کی کواری میں کام کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں مالک لوگ ایسے سیدھے نہیں ہونگے اپنا بس چلے تو پانی تو کیا ہوا بھی بیچ دیں۔ ان کے لئے تو بس ـــ"

اس نے پھر گھونسا اٹھایا

تاج نے اپنی مضبوط چھڑی اٹھائی۔

قریب کی ٹولیوں سے دو تین اور آدمیوں نے دلچسپی لینی شروع کی ہوتے ہوتے ایک مجمع اکٹھا ہو گیا۔ بہاری کہہ رہا تھا سنو بھائیو! اکثر لوگ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ کوئی بینک کی چیک بک تو لے کر چلے نہیں تھے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ رستے میں یہ حادثہ ہوگا ہم تو بس ایک ٹکٹ اور ایک لوٹا لے کر چلے اور انٹی میں چند آنے تھے۔ جو اس کمبخت پوتی لال نے اپنی سے دھر لئے۔ اب سوال یہ ہے کہ لوگ پیاسے ہیں اور پوتی لال بغیر رکے پانی نہیں دیتا۔"

"پوتی لال کی ایسی تیسی" بہت سے لوگ ایک دم سے چلائے۔

بہاری بولا۔ "وہ پانی کا بھاؤ بڑھا رہا ہے۔ جو سیکنڈ کلاس میں تھے

ایئر کنڈیشنڈ والے ہیں۔ وہ تو خیر پانی کے سونے کے داموں خرید کر بھی پی سکتے ہیں مگر ہم غریب لوگ کیا کریں جن کی انٹی میں جن کا بینک ہے جن کی پونجی ایک ٹرنک ایک دھوتی اور ایک لوٹا ہے۔ جسے چاہے وہ گاڑی میں رکھ لیں چاہے جمپر میں ڈال لیں۔ ہم غریب لوگ کہاں سے پانی پئیں ہم تو روز کنواں کھود دیتے ہیں اور روز پانی پیتے ہیں۔"

بہاری غصے میں دونوں ہاتھ زور زور سے ہلانے لگا۔ اسے اب اپنی تقریر میں مزہ آنے لگا۔ لوگ اور اکھٹے ہوتے جا رہے تھے۔ مجمع میں غصہ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔

تاجدین آگے بڑھ کے بہاری کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ بولا

"یہ میری بیوی ہے۔ دیکھو اس کے کان کی بالیاں نہیں ہیں دیکھو اس کے کان خالی ہیں کہاں گئے وہ اس کے چاندی کے بندے تم سے تم سے سب سے کہتا ہوں تم کو یقین نہیں آئے گا۔ میں نے آج اپنی بیوی کی بالیاں بیچ کے پانی پیا ہے۔

"ہائے ہائے!" ایک موٹی سی عورت چلائی۔ "کیسا ظلم ہے میں نے مانگا تو بولا پیسے لاؤ۔ میں نے کہا پیسے نہیں ہیں۔ تو بولا کہیں سے مانگ کے لاؤ۔ آخر میں نے اپنے پاؤں سے چاندی کا چھلا اتار کے دے دیا۔ تب جا کے اس نے مجھے پانی دیا۔"

"لال مردہ باد!" مجمع غصے سے چلایا۔

وہ موٹی عورت بولی "تم لوگ میرے ساتھ چلو۔ اگر مرد ہو تو میرے

پیچھے پیچھے آؤ۔ میں تنہا اسے درست کر دوں گی۔ لوگ ایسے موقعوں پر سیوا کرتے ہیں۔ کنویں کھدواتے ہیں سبیلیں لگواتے ہیں یہ جو پانی ہے اسی کے پیسے سے رہا ہے۔ کوئی ماں کا بچہ جو میرے ساتھ آئے گا؟"

" چلو چلو۔ مجمع سے بہت سی جوشیلی آوازیں یک دم آئیں "ہم سالے کی ٹانگیں چیر کے پھینک دیں گے"

" اس کی پانی کی بالٹیوں میں اس کا لہو بھر دیں گے ہا ہا ہا"
ایک انتہائی دبلا پتلا آدمی غصے سے چلایا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور دہشت زدہ تھیں اور اس کی گردن کا حلقوم باہر نکلا ہوا تھا۔ اور بار بار کھانستا تھا۔ "ارے بیٹا پھانسی ہو جائے گی" زرد دانتوں والا۔ کھچڑی دھوتی والا سر پہ کالی ٹوپی پہنے ہوئے ایک کمزور دل بنیا بولا۔ "خفگی طوطے طوطے کی ٹیں ٹیں کر رہے ہو۔ عدالت میں جا کے تو بات نہیں کر سکو گے۔

دبلے پتلے آدمی نے انتہائی غصے سے بنیے کی طرف دیکھ کے کہا "اپنے بھائی کی طرف داری کرتا ہے نا۔ سالے وہ بھی بنیا، تو بھی ۔۔ سا
پہلے میں تجھی کو ٹھیک کرتا ہوں۔

دبلے پتلے آدمی نے بنیے کی طرف تہدیدی انداز میں دیکھ کر آگے قدم بڑھا دیئے بنیا ہاتھ سے روکتے ہوئے بولا "ارے آپس میں کیوں لڑتے ہو جو دشمن ہے پہلے اسے تو ختم کر لو۔ یہ دیکھو جیسے پھانسی کا رعب کھاتا ہے۔ دیکھو نا" دبلا پتلا آدمی بنیے کی طرف سے دیکھ کر انتہائی جوش میں بولنے لگا "میں پھانسی سے ڈرتا ہوں مجھے تو ان لوگوں

.. نے پہلے ہی سے پھانسی پر لٹکا رکھا ہے۔ مجھے ننیسار درجہ تیسرے ق کا ہے۔ سالے یہ کہہ کر پھر بنیئے کی طرف بڑھا۔ بنیا ایک دم چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ بہاری نے گھونسا تان کے کہا۔

" چلو دوستو مورچے کی طرف۔ وہ رہا۔ سامنے سیٹھ پوتی لال کا ٹیلہ۔ جہاں ہمارے امرت کا چشمہ ہے۔"

" پانی زندہ باد۔"

" پوتی لال مردہ باد۔"

وہ لوگ ساٹھ ستر کے قریب ہوں گے چیختے چلاتے نعرے لگاتے ہوئے پوتی لال کے ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے۔ پہلے تو تیز تیز چل رہے تھے پھر جوں جوں سب آتا گیا۔ انکے قدم دھیمے پڑتے گئے ٹیلے کے دس گز کے فاصلے پر ہجوم خود بخود رک گیا۔

ٹیلے کے سامنے پوتی لال اور گردھاری لال کو امرت میں لیے پہلوان دھاما سنار اور اس کا پٹھا گوپت۔ استاد فقیرا اور معراج سینہ تانے کھڑے تھے۔

دھامے سنار نے پوچھا کون آگے بڑھتا ہے؟

ہجوم نے ایک دوسرے کی طرف ادھر ادھر دیکھا صرف تاجدین کے پاس ایک چھڑی تھی۔ دھامے سنار نے آگے بڑھ کے چھڑی اس کے ہاتھ سے چھین کر توڑ دی اور اسے ایک گھونسہ دے کر کہا۔

" جا بیمار ہے۔ اس لیے چھوڑ دیتا ہوں۔"

بہاری غصے سے آگے بڑھ گیا اس نے گھونسا تانا۔ مگر گوپت نے فوری

لنگڑی مار کر اُسے نیچے گرا لیا۔ اس کی چھاتی پہ چڑھ بیٹھا اور اس کے رخسار دں پہ دائیں بائیں گھونسے لگانے لگا۔ بہاری کے منہ سے خون جاری ہو گیا خون دیکھ کر مجمع میں سے دو چار آدمی آگے بڑھے انہیں تیغ رے اور معراج نے سنبھال لیا۔ چند منٹوں میں ہجوم تتر بتر ہو گیا۔ صرف بہاری ریت پر پڑا خون تھوک رہا تھا۔ دھامے لما سے زور سے ایک لات لگاتے ہوئے کہا۔

"بھاگ جاؤ۔ اور پھر کبھی۔۔۔ ادھر کا رُخ کیا تو جان سے مار دونگا۔ سالے آئے ہیں پانی مانگنے۔ مفت خورے کہیں کے یہاں تمہارے باپ کی خیرات بٹتی ہے کیا ___ ؟"

نرنیدر کو غلام رسول نے ہجوم میں جانے سے روک دیا تھا۔ "کوئی خلافِ قانون تم سے حرکت ہو گئی تو میری پنشن ضبط ہو جائے گی"

"مگر یہ تو ظلم ہے" نرنیدر نے بہاری کو دور سے پٹتے دیکھ کر کہا

"ظلم نہیں ہے دکان داری ہے" غلام رسول نے کسی تلخی کے کہا۔

"میں تو جاؤں گا" نرنیدر اٹھنے لگا

"کیسے جاؤ گے!" غلام رسول نے بڑی سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور آ سے بولا ___

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں سب کے سامنے پھر تمہیں ہتھکڑی پہنا دوں!"

نرنیدر مجبور ہو کر ریت پہ بیٹھ گیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

پندرھواں باب

ناجیدین کی بیوی نے تاج کے ہاتھ پاؤں دباتے ہوئے کہا میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ مگر تم نہیں مانتے"

بہاری پیچھے سے اپنا لہو پونچھ رہا تھا۔ اس کا پرانا کوٹ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اس نے کوٹ اتار کے ریت پر رکھ دیا۔ اس کی قمیض اندر سے جگہ جگہ تار تار اور پھٹی ہوئی نظر آئی۔ حمیدہ اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی۔ بہاری نے کہا میں اس لئے یہ کوٹ نہیں اتارتا ہوں قمیض بہت پھٹ گئی ہے کوٹ سے بھی زیادہ بدصورت نظر آتی ہے"

بہاری لہو پونچھتے ہوئے ہنسنے لگا۔ پھر بولا

"یہ سب لوگ کھگوڑے ہیں کھگوڑے اگر میری تجھ کی کراکری کے مزدور

ہوتے تو ...."

" تو پھر کیا ہوتا؟ تاجدین کی بیوی نے غصے سے پوچھا۔

بہاری کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اتنے میں سب کی نظر جمال پر پڑی ایک بڈھے کسان کو ساتھ لئے سر پر گھڑا رکھے چلا آ رہا تھا حمیدہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جمال کے آنے سے وہ اس قدر خوش ہوئی کہ آس پاس کے لوگوں کا لحاظ کئے بغیر وہ اس کی طرف بانہیں پھیلا کے بھاگی۔ پھر جلدی سے اس سر سے گھڑا اتار کے اپنے سر پر رکھ کر اس کے پیچھے چلنے لگی۔

تاج نے پوچھا" یہ پانی کہاں سے لائے؟"

"کنوئیں سے۔"

"کنواں کہاں ہے؟"

جمال نے مسکرا کر پہاڑی کے اوپر چھتری کی طرف اشارہ کر کے کہا" چھتری کے نیچے پہاڑی کی دوسری طرف یہ پوتی لال ویں سے پانی منگواتا کنواں اس کسان کا ہے۔ پوچھ لو اسی سے۔"

بڈھے کسان نے اثبات میں سر ہلایا" اس چالاک بنیئے نے سات کیلئے کنواں مجھ سے کرائے پر لے لیا۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ معاملہ ہے ورنہ نہ دیتا۔ اپنے ہاتھ سے مسافروں کو مفت پانی پلانا یہ تو دھرم کا کام"

منافع میں دھرم نہیں دیکھا جاتا میرے باپ! جمال نے کہا

"وہ تو ٹھیک ہے" بڈھے کسان نے اپنی انٹی کھول کر چالیس روپے نوٹ نکالتے ہوئے کہا، میں نے یہ چالیس روپے اس سے لئے تھے دیکھو۔"

اس موجودہ حالت میں یہ چاہتا ہوں میں یہ چالیس روپے اسے واپس کردوں پھر ان مجھے واپس مل جائے گا۔ پھر گاڑی کے مسافروں کو تکلیف نہیں ہوگی۔

بہاری نے کہا "تو جاؤ۔ اسے روپے واپس کردو۔"

بڈھا جمال کی طرف دیکھنے لگا جمال نے کہا ٹھیک کہتا ہے کوشش کرکے دیکھو کیا کہتا ہے۔

بڈھا چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آگیا بولا "وہ کہتا ہے میں روپے لوں گا۔ بس سات دن تک تمہارے کنویں سے پانی لیتا رہونگا۔"

"روپے اپنی آنٹی میں رکھو۔ جمال نے فیصلہ کن انداز میں کہا "یہ سیدھی طرح سے نہیں مانے گا۔ اس لئے دوسری ترکیب کرنی پڑے گی۔

بہاری نے کہا۔ وہ ہم کرکے دیکھ چکے ہیں۔ بہاری نے سوچے ہوئے جبڑے دکھائے تاج نے ہجوم کو لے کر پونی لال کے پاس جانے کی ساری داستان بیان کی۔

"اس نے پہلوان پال رکھے ہیں۔" حمیدہ بولی۔

"وہ تو میں دیکھ آیا ہوں۔ کنویں پر بھی اس نے پندرہ بیس کے قریب پہرہ لگا رکھا ہے۔ گاڑی کے کچھ لوگوں کو اس نے مفت روٹی اور پانی کا لالچ دے کر اپنی طرف کر لیا ہے۔ اور اس کم بخت جگہ میں معلوم نہیں ریلیف ٹرین کب آئے گی؟"

"تم نے گارڈ سے پوچھا؟" عابدین بولا۔

"گارڈ بھی کچھ نہیں بتاتا۔

"سالار وہ بھی پوتی لال سے مل گیا ہوگا" بہاری غصے میں بولا۔
جمال نے کہا "دوستو! سوال زندگی اور موت کا ہے کھانے کے بغیر تو ہم لوگ کچھ دیر زندہ رہ سکتے ہیں مگر پانی کے بغیر اب ایک لمحے زندہ نہیں رہ سکتے اور گاڑی میں کم سے کم چار پانچسو ایسے مسافر ہوں گے جن کے پاس اب پانی نہ کھانے کی قیمت چکانے کے لئے پیسے ہیں اگر ہم سب ان لوگوں کو متحد کریں تو اتنے آدمیوں سے سیٹھ پوتی لال کے آدمی نہیں لڑ سکتے بس کتنے آدمی ہیں وہ۔ چار پہلوان اور پندرہ سولہ کرائے کے ٹٹو اتنے آدمی چار یا آدمیوں کی متحد طاقت کے سامنے نہیں لڑ سکتے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ہم سب لوگ مل کے لوگوں کے پاس چلیں انہیں بتائیں کس طرح پوتی لال نے ایک معصوم کسان کو ٹھگ کر اس سے کنواں حاصل کیا اور ہمارے گلے میں منافع کا پھندا ڈالے بیٹھا ہے انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ سب ہمارے ساتھ مل کے کنوئیں کی طرف مارچ کریں پھر میں دیکھتا ہوں میں ہمت ہے کہ ہمارے سامنے آسکے۔"
اور اب کے ہم ہٹنے نہیں جائیں گے۔ بہاری نے زمین سے ایک لکڑی اٹھا کے کہا۔

سولواں باب

کنویں کی دریافت سونے کی کان کی دریافت سے کم نہیں تھی آن
واحد میں یہ خبر گاڑی کے سب مسافروں تک پہنچ گئی کہ پہاڑی کے اس طرف
ایک کنواں ہے جس کا پانی یہاں مسافروں میں بیچا جا رہا ہے۔ جمال اور بیاری
اور وہ بڈھا کسان اور بہت سے من چلے اب مختلف لوگوں کی ٹولیوں میں گھوم
رہے تھے سمجھانے کی بھی ضرورت نہ تھی کیونکہ اکثر لوگوں کی جیب میں پیسے نہیں تھے
کہ پانی خرید سکتے پانی کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے اور یہ معلوم نہیں ہوتا تھا
کہ ریلیف ٹرین کب آئے گی۔ شاید ابھی دو دن نہ آئے یا دس دن۔
آئے ابس سارے گارڈ کا کوئی بھر وسہ نہیں۔ کم بخت سیٹھ پوتی لال
سے مل گیا ہے۔ خواہ مخواہ دیر کر رہا ہے۔ ورنہ کیا بات ہے بچہ

اب تک ریلیف ٹرین نہ آئی - اب تو کنوئیں پر قبضہ کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ سب پیاسے مر جائیں گے۔ اس طرح کی باتیں کی جا رہی تھیں اور بلیے سے لکڑیاں بینچوں کی کھپچیاں - اور لوہے کی سلاخیں نکالی جا رہی تھیں - ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پچاس سے ساٹھ ہوئے ساٹھ سے سو ہوئے سو سے دو سو دو سو سے چار سو چار سو سے چھ سو غیروں کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ لکڑیاں ہوا میں گھمائی جا رہی تھیں - آنکھوں کی برافروختہ چمک تیز ہوتی جا رہی تھی اور سیکنڈ کلاس کے مسافروں اور رائزکنڈ لیبنڈ ڈبے والوں کا خوف و اضطراب بڑھتا جا رہا تھا ۔ وہ بہت ہراساں نظر آتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں نے اپنا سامان لے کر سرکنا شروع کیا اور ادھر ادھر کے ٹیلوں سے دیکھتے ہوئے پہلے تو سیٹھ پوتی لال کے ٹیلے کے پاس پہنچے مگر جب وہاں بھی مدافعت کا سامان کم پایا تو وہ وہاں سے بھاگ کر پہاڑی کے اوپر چوبرجی میں پہنچ گئے۔ سیٹھ پوتی مال نے بھی مناسب سمجھا کہ ٹیلے پر پانی کے برتن وغیرہ چھوڑ کر اپنی جمعیت مختلف حصوں میں بانٹنے کی بجائے ساری طاقت کنوئیں کو بچانے میں لگا دی جائے اس لئے وہ سب لوگ اب چوبرجی میں بھی نہ رہے بلکہ سیٹھ کے کہنے میں آ کر چوبرجی سے بھی کھسک گئے اور نیچے کنوئیں پر چلے گئے ۔ ادھر جب ہجوم نے دیکھا کہ پوتی لال نے اپنا ٹیلہ چھوڑ دیا ہے تو جالی کے کہنے کے باوجود ہجوم نے اپنا نظم اور ضبط چھوڑ دیا اور لوگ بے ترتیبی سے بھاگ بھاگ کر پوتی لال کے ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے۔ مگر پوتی لال کے ٹیلے پر پہنچ کر لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی ۔ پانی کے جتنے بڑے بڑے ڈرم تھے

سب خالی تھے۔ کسی میں گیلی ریت پڑی ہوئی تھی۔ تو کوئی ریت پر لڑھکا ہوا تھا۔ سب برتن خالی تھے۔ پانی کسی میں نہ تھا۔ لوگوں کی امید مایوسی میں بدل گئی اور ان کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا۔ لوگ پوتی لال کے خلاف جوش سے نعرے لگانے لگے اور زور زور سے چلانے لگا۔ اس طرح غیر منظم اور بے ترتیبی کے عالم میں مگر انتہائی غم کی حالت میں پاگلوں کی طرح مضطرب اور بے قرار ہو کر حویلی کی طرف دوڑنے لگے کہ جمال نے ٹیلے پہ چڑھ کر کہا نہیں رکو۔

"دوستو! اگر اس طرح جاؤ گے تو پہلوانوں سے پٹو گے اس طرح نہ کوئی راستہ ہے نہ پیر اس طرح یوں تم پانچ چھ سو آدمی ہو۔ مگر در اصل ایک بچے سے بھی زیادہ کمزور ہو کیونکہ تمہیں اپنی طاقت کا نہ ہمت کا اندازہ ہے۔ اور تمہیں یہ معلوم ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ کیسے کرنا ہے۔ بس ایک جوش میں بہے چلے جا رہے ہو۔ میں کہتا ہوں پھر پٹو گے۔

مجمع بھاگتا بھاگتا رک گیا۔

جمال نے بہاری سے کہا۔ بہاری ان سب لوگوں کو پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں بانٹ لو۔ ہر ٹکڑی ایک دوسرے کے پیچھے باقاعدہ چلے ہر ٹکڑی ایک افسر ہونا چاہیے۔ باقاعدہ۔ ہاں اور ایک آدمی کی نگرانی میں سب کا ہوگا۔ یہ نہیں کہ چاروں طرف سے شور مچا ہوا ہے کان پڑی آواز سنائی دی کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ ایسا کرو گے تو پھر پٹو گے

وقت تو لگا مگر لوگوں کو اس تنظیم میں مزہ آنے لگا۔ لوگ پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں ہو گئے عورتوں اور بچوں کو اور بڈھوں کو انہوں نے وہیں

ریل گاڑی کے پاس سامان کی حفاظت کے لئے چھوڑ دیا کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بہت خوفزدہ تھے۔ یا بزدلی سے اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ چاہے وہیں ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے ان کا دم کیوں نہ نکل جائے وہ لوگ بھی تماشائی بنے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔

اب کے جمال کی قیادت میں پانچ پانچ کی ٹکڑیوں کا یہ جلوس چلا تو اس میں ایک ترتیب تھی۔ ایک رعب تھا۔ ایک منظم کیفیت تھی یہ لوگ اس وقت ایک ہی گاڑی کے تھے ایک ہی کلاس کے ڈبے تھے۔ ایک ہی انجن کے پیچھے لگے تھے۔ اور ایک ہی سمت میں جا رہے تھے۔

سترھواں باب

نریندر نے بہت دور سے مجمع کو گھاٹی سے نیچے اترتے دیکھا۔ جوشیلے نعروں کی گونج گھاٹیوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر چاروں طرف گونج جاتی تھی سیٹھ پوتی لال کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ مگر پہلوان لوگ اسے بار بار سنبھالا دیتے جاتے تھے۔ اور اُنکے ساتھ دوسرے پچاس ساٹھ آدمی جو پانی اور روٹی کے لالچ میں آکر سیٹھ کا ساتھ دے رہے تھے۔ پہلی پانچ سات ٹکڑیوں تک تو خیر پہلوانوں کو بھی اطمینان رہا مگر جب گھاٹی سے ایک کے بعد دوسری ٹکڑی اترنے لگی اور پہلوانوں کو معلوم ہوا کہ آدمی پچاس ساٹھ یا سو نہیں ہیں بلکہ ان سے کہیں زیادہ ہیں تو وہ بھی اندر سے گھبرانے لگے مگر اوپر سے اسی طرح دلیری اور بہادری بلکہ ہیکڑی کی باتیں کرنے لگے

نربندر کا جی بہت چاہتا تھا کہ وہ بھی اس ہجوم میں شریک ہوتا مگر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ اور وہ راجکماری سے منہ موڑے غلام رسول کے پاس چپکا بیٹھا تھا۔

غلام رسول کا چہرہ زرد تھا اور غلام رسول کے پاس بیٹھے ہوئے گارڈ کا چہرہ بھی زرد تھا اور ان کے قریب بیٹھے ہوئے کھنہ اور چھگن لال اور وہ دونوں سندھی تاجر اور وہ سوسائٹی کی تتلیاں شکنتلا اور نرملا جو ایرکنڈیشنڈ ڈبوں میں پنکھوں اور ریڈیوں اور نہاں دستوں میں اس قدر رنگین اور دلچسپ نظر معلوم ہوتی تھیں۔ اسوقت بڑی پھیکی سیٹھی اور بیاہی نظر آرہی تھیں ان کی نگاہوں کی چمک اور رخساروں کا غازہ ہونٹوں کی لپ اسٹک کہاں اڑ گئی تھی رخساروں پر خوف دہراس کے دھبے دھبے سے نظر آرہے تھے اور کٹے ہوئے ابروؤں کے نیچے کی جلد کتنی کھدری اور بدصورت معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بالکل کڑک مرغیوں کے انداز میں بے دل اداس بیٹھی تھیں نربندر انہیں دیکھ کے مسکرایا وہ آہستہ سے راجکماری کی طرف بڑھا راجکماری بڑی حیرت اور دلچسپی سے لوگوں کی ٹکڑیوں کو گھاٹی سے نیچے اترتا دیکھ رہی تھی۔ پہلے صرف دلچسپی تھی۔ پھر حیرت بڑھی تو یہ سب وہ لوگ تھے! عوام! مگر کیا یہ وہی لوگ ہیں جو گاڑی میں سوار تھے جو غریبی اور مفلسی کی حالت میں انتہائی نکہت اور یاس کے عالم میں سر جھکائے گاڑی کے اندر بیٹھے تھے۔ اور امیروں کی طرف کس عاجزی سے دیکھتے تھے۔ ان میں نئی طاقت اور قوت کہاں سے آگئی۔ کس طرح یک لخت بدل گئے جیسے وہ جو انسان نہ ہوں تخلیق

سترھواں باب

نرنیدر نے بہت دور سے مجمع کو گھاٹی سے نیچے اترتے دیکھا۔ جوشیلے نعروں کی گونج گھاٹیوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر چاروں طرف گونج جاتی تھی سیٹھ پوتی لال کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ مگر پہلوان لوگ اسے بار بار سنبھالا دیتے جاتے تھے۔ اور انکے ساتھ دوسرے پچاس ساٹھ آدمی جو پانی اور روٹی کے لالچ میں آکر سیٹھ کا ساتھ دے رہے تھے۔ پہلی پانچ سات ٹکڑیوں تک تو خیر پہلوانوں کو بھی اطمینان رہا مگر جب گھاٹی سے ایک کے بعد دوسری ٹکڑی اترنے لگی اور پہلوانوں کو معلوم ہوا کہ آدمی پچاس ساٹھ یا سو نہیں ہیں بلکہ ان سے کہیں زیادہ ہیں تو وہ بھی اندر سے گھبرانے لگے مگر اوپر سے اسی طرح دلیری اور بہادری بلکہ ہیکڑی کی باتیں کرنے لگے

نریندر کا جی بہت چاہتا تھا کہ وہ بھی اس ہجوم میں شریک ہوتا مگر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ اور وہ راجکماری سے منہ موڑے غلام رسول کے پاس چپکا بیٹھا تھا۔

غلام رسول کا چہرہ زرد تھا اور غلام رسول کے پاس بیٹھے ہوئے گارڈ کا چہرہ بھی زرد تھا اور ان کے قریب بیٹھے ہوئے کھنڈر اور چھگن لال اور وہ دونوں سندھی تاجر اور وہ سوسائٹی کی تتلیاں شکنتلا اور نرملا جو ایرکنڈیشنڈ ڈبوں میں بیٹھیں اور یہ دن اور یہاں دوستوں میں اس قدر رنگین اور دلچسپ نظر معلوم ہوتی تھیں۔ اسوقت بڑی پھیکی سیٹھی اور بیاہی نظر آ رہی تھیں ان کی نگاہوں کی چمک اور رخساروں کا غازہ ہونٹوں کی لپ سٹک کہاں اڑ گئی تھی رخساروں پر خوف دہراس کے دھبے دھبے سے نظر آ رہے تھے اور لٹکتے ہوئے ابروؤں کے نیچے کی جلد کتنی کھدری اور بدصورت معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بالکل کڑک مرغیوں کے انداز میں بے دل اور اداس بیٹھی تھیں نریندر انہیں دیکھ کے مسکرایا وہ آہستہ سے راجکماری کی طرف بڑھا راجکماری بڑی حیرت اور دلچسپی سے لوگوں کی ٹکڑیوں کو گھاٹی سے نیچے اترتا دیکھ رہی تھی۔ پہلے صرف دلچسپی تھی۔ پھر حیرت بڑھی تو یہ سب وہ لوگ تھے! عوام! مگر کیا یہ وہی لوگ نہیں جو گاڑی میں سوار تھے جو غریبی اور مفلسی کی حالت میں انتہائی نکہت اور یاس کے عالم میں سر جھکائے گاڑی کے اندر بیٹھے تھے۔ اور سیٹھوں کی طرف کس عاجزی سے دیکھتے تھے۔ ان میں نئی طاقت اور قوت کہاں سے آ گئی۔ کس طرح یک لخت بدل گئے جیسے وہ مجبور انسان نہ ہوں تخلیق

کرنے والے دیوتا ہوں۔ انکی آنکھوں کی چمک لہجے کی کھنک قدموں کی دھمک کبھی انجانی۔ ان دیکھی ان بوجھی قوت کے سرچشمے کا سراغ دیتی تھی۔ پھر جوں جوں وہ لوگ قریب آتے گئے راجکماری کی حیرت گم ہوتی گئی۔ اور ہراس بڑھتا گیا۔ کیا یہی وہ لوگ ہیں جن پہ وہ حکومت کرتی تھی۔ اور اس کا باپ حکومت کرتا تھا۔ جو اس کے لئے ریلوے اسٹیشن پر جلوان بچھاتے تھے چاندی کے گلاس میں پانی لاتے تھے۔ اور میونسپل کمیٹی کے ایڈریس پیش کرتے تھے اور اس کے قدموں تلے اپنی آنکھیں بچھاتے تھے۔ یکایک راجکماری کو محسوس ہوا جیسے اب تک اس نے لوگوں کو دیکھا نہ تھا۔ سمجھا نہ تھا محسوس کر کے ان کا اندازہ نہ کیا تھا۔ مگر اس ایک لمحے میں اس نے محسوس کر لیا کہ یہ نو نئی قوت ہیں۔ کوئی نئی تنظیم ہیں کوئی نئی تصویر ہیں ان میں تو شیروں کی سی بہادری پہاڑوں کی سی قوت اور ندیوں کی سی روانی معلوم ہوتی ہے۔ یہ لوگ تو برابر آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ راجکماری سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی۔

نریندر نے کہا۔

"خدا کے لئے میری ہتھکڑی کھول دو"

"آرام سے بیٹھو" غلام رسول نے بڑی سختی سے کہا "تمہیں اس جھگڑے میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

"کیا وہ لوگ ہمیں مار ڈالیں گے؟" راجکماری نے ہراساں ہو کے پوچھا۔

"میرے پاس بندوق ہے" غلام رسول نے بڑی سختی سے جواب دیا۔
"اور تیرے پاس بھی ہے" گارڈ نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے اپنے چہرے پہ دلیری کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا "مجھے چلانا نہیں آتا۔ بندوق بندوق ہے۔ دشمن کی طرف اٹھا کے داغ دی جائے تو کوئی تو مرے گا"
گارڈ ہنسا اور اس کیساتھ کوئی اور نہیں ہنسا۔
ٹکڑیاں قریب آ رہی تھیں۔
"یہ تو کوئی تین سو کے قریب آدمی معلوم ہوتے ہیں" دھامے سنار نے گننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"مگر ابھی گھاٹی سے اور ٹکڑیاں اتر رہی ہیں استاد" گوپت کی آواز میں خفیف سی لرزش تھی۔
"آنے دو سالوں کو دھوبی پٹڑا مار مار کے ختم کر دوں گا" دھامے سنار بے جگری سے بولا۔
"کہیں تمہارا اپنا ہی پٹڑا نہ ہو جائے استاد" نریندر نے طنزاً کہا دھامو غصّے سے نریندر کیطرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھ کے اوپر گرد کے دھبّے اور بھی سیاہ نظر آنے لگے مگر اسوقت اس غصّے کو پی گیا۔ چھگن لال بولا "باپ رے یہ تو کوئی چار سو سے زیادہ آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔
حاجی علیلے بولا "اور ابھی اور ٹکڑیاں گھاٹی سے اتر رہی ہیں"
"کھنہ بولا" میرے پاس چھ لوڈڈ پستول ہے حرامزادوں کا بھرکس نکال دوں گا

پوتی لال نے بھی پستول دکھایا" ایک میرے پاس بھی ہے۔ مگر اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

شکنتلا نے بڑی مایوسی سے کہا" یہ لوگ تو ابھی چلے ہی آ رہے ہیں ہیں سمجھتی ہوں۔ پانسو سے کم نہیں ہونگے۔ دیکھو

ٹکڑیاں گھاٹی سے اتر رہی تھیں۔ بیچ برجی سے نیچے ندی تک ٹکڑیوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ پہلی ٹکڑیاں اب سوکھی ندی کے پتھروں پر چل رہی تھیں۔ آگے آگے جمال تھا۔ اور وہ بڈھا کسان زخمی شاعر اور ڈاکٹر کا منتھ بھی پہلی ٹکڑی میں نظر آ رہے تھے۔

" یہ شاعر بھی ادھر چلا گیا۔ اپنا زخمی بھائی جابی عیسے نے افسوس سے کہا۔

" ارے ان شاعروں کا کیا بھروسہ"

" اور اپنا ڈاکٹر بھی! دلیپائی وکیل نے بڑے غصے سے کہا۔ غنڈوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ بدمعاشوں اور غنڈوں کا

" اور کیا کرتا" ایک سندھی تاجر بولا۔ ناگپور میں اس ناگپور میں اس کی پریکٹس نہیں چلتی تھی۔ اب لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں

گارڈ بولا وہ لوگ قریب آ رہے ہیں۔ بندوقیں تیار رکھو۔ گارڈ نے اپنی بندوق اس زور سے پکڑی جیسے پانی میں ڈوبتا ہوا آدمی بہتے ہوئے لکڑی کے تختے کو پکڑتا ہے۔

سکھ نے کہا" تم فکر نہ کرو۔ میرا پستول پہلے سے بھرا رکھا ہے میں ان باغیوں سے نپٹنے کی پہلی کر دوں گا۔۔۔"

جھگن نے دھیرے سے کہا۔ "میرا خیال ہے ہم لوگ بھاگ چلیں۔"

"نہیں" کہنے کے منہ سے پہلے تو بے اختیار نکلا۔ پھر جب اس نے جھگن دیکھا اور شکنتلا اور نرملا کی طرف تو اسے ان تینوں چہروں پہ ایک ہی خیال ہوا نظر آیا۔ بھاگ چلیں! بھاگ چلیں!! بھاگ چلیں!!! یکایک اس کا جی یہی چاہا کہ وہ اس مقام سے کہیں دور، بہت دور بھاگ جائے اس کے کانوں ہجوم کا شور اس کے نعروں کی گونج اور انکی دھمکیاں بڑھتی گئیں۔ اس نے اپنا پستول جیب میں رکھا اور بالکل بدحواس ہو کر ندی کے اوپر کی جانب بھاگنا کردیا۔ اسے دیکھ کر جھگن مل بھی بھاگا اور نرملا اور شکنتلا بھی بھاگیں ان کی اونچی ایڑی والے جوتے وہیں ندی میں رہ گئے ایک اس پتھر پہ دوسرا دو گز کے فاصلے پر وہ طرف سے چیختے اور چلاتے ہوئے کنوئیں سے دور جدھر سے ہجوم آرہا تھا اسکی سمت میں بھاگتے گئے، بے سوچے بغیر بھاگنے لگے بس انہیں یہی احساس تھا کہ وہ جلدی ہو سکے۔ اس کنوئیں سے دور بھاگ جائیں۔ انہیں بھاگتے دیکھ کر گلاس والے دونوں آدمی بھاگ کھڑے ہوئے ان کے ساتھ پوتی لال کے چار آدمیوں کے قدم بھی اکھڑ گئے۔ سیٹھ پوتی لال چلا کر کہنے لگا "ارے کہاں جاتے نمک حراموں میں تم کو پیسے دیتا ہوں۔ روٹی دیتا ہوں، پانی دیتا ہوں۔"

"سیٹھ ہمیں اپنی جان بچانی ہے۔" ان میں سے ایک آدمی بھاگتا بھاگتا

ہجوم قریب آرہا تھا۔

گاوڈ نے غلام رسول سے کہا۔ تم بندوق لیکر کھڑے ہو جاؤ اور مجمع کو آگے بڑھنے

سے روک دو،

ہاں ہاں بس یہ ٹھیک ہے پولیس مین کو دیکھیں گے تو کچھ دل میں سوچیں گے اور میں اُٹھ کے کہوں گا کہ یہ مجمع خلافِ قانون ہے "

"تم کہاں کے مجسٹریٹ ہو جو اس مجمع کو خلاف قانون قرار دو گے" نریندر غصے چلایا اگر غلام رسول اس مجمع پر گولی چلائے گا تو خود جیل میں جائیگا "

غلام رسول نریندر کی طرف دیکھ کر گارڈ کی جانب اور پھر دیسائی کی طرف دیکھنے لگا۔ گارڈ نے کہا۔

" میں حکم دیتا ہوں۔"

نریندر نے کہا تم کون ہوتے ہو حکم دینے والے؟ یہ کوئی ریلوے کا پولیس مین ہے تم کوئی مجسٹریٹ نہیں ہو میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔ تم اس بدمعاش سیٹھ تھ مل گئے ہو جس نے ایک غریب کسان کو دھوکا دے کر ایک کنواں حاصل اور اب اس کے بل بوتے پر روپیہ کمانا چاہتا ہے۔"

" ہوش میں آؤ" گارڈ اپنے پیلے پیلے دانت دکھاتے ہوئے بولا میں تمہیں گولی مار دوں گا "

غلام رسول نے بندوق گارڈ کی طرف تان لی" خبردار جو تم نے میرے قیدی ف دیکھا بھی، یہ میری تحویل میں ہے اور جو کچھ کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے۔ اس جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ چلو نریندر!

یندر نے کہا" کہاں جائیں گے۔ یہیں بیٹھو۔ تماشا دیکھو۔ بس تم اپنی بندوق چلاؤ۔ اگر تم اپنی پنشن چاہتے ہو "

"میں تمہارے بھلے کے لئے کہتا ہوں"

ہجوم قریب آ رہا تھا۔ اب اُسکے نعرے صاف سنائی دے رہے تھے۔

"پوتی لال مردہ باد!"

"پانی ——— لے کے رہیں گے"

"روٹی ——— لے کے رہیں گے"

"پانی زندہ باد!"

"روٹی زندہ باد"

"پانی، روٹی ہمارا پیدائشی حق ہے۔

"پانی چھیننے والا، روٹی چھیننے والا۔ زندگی چھیننے والا ہے"

"ہم زندگی چھیننے والوں کو ختم کر دیں گے"

"پانی زندہ باد!"

حاجی عیسٰے نے گھبرا کر کہا "میرے خیال میں ہمیں صُلح کر لینی چاہیئے"

ایک حلوائی بولا "ہاں ہاں۔ میرے خیال میں یہی بہتر ہے"

پوتی لال نے اپنے حمایتیوں کی طرف بار بار دیکھا۔ بار بار اُن کے خا
چہروں پر اُسے وہی جذبہ چمکتا نظر آیا۔ جو حاجی عیسٰے کے چہرے پر تھا۔

"اچھا ان سے کہو" پوتی لال بے بس ہو کے بولا "ان سے کہو وہ اس کنو
میرا حق مان لیں۔ اور میں اس کے عوض میں اُن سے پانی کے گلاس کے چا
نہیں لوں گا۔ صرف ایک آنہ لوں گا"

ہجوم قریب آ رہا تھا۔ اب کنوئیں سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر رہ

حاجی علیلے اپنی بکرا سی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آگے ہجوم کیطرف بڑھے۔ ہاتھ میں ایک سفید رومال ہلاتے ہوئے۔

ہجوم سے شور بلند ہوا۔ کچھ سو گلوں سے ایک ساتھ آواز نکلی۔

"حاجی علیلے مردہ باد"

حاجی علیلے کا دل دہل گیا مگر وہ بدستور آگے بڑھتا گیا اور سفید رومال ہلاتا گیا۔

"رک جاؤ۔ رک جاؤ" بھال نے پیچھے ہجوم کیطرف اشارہ کرکے کہا "وہ لوگ سفید جھنڈی دکھا رہے ہیں۔ صلح چاہتے ہیں"

"صلح!"

"صلح!"

حاجی علیلے نے قریب آکے کہا "رک ڈ بھائیو! میں آپ کو خوشخبری سنانے آیا ہوں۔ گو ہمارے پاس بندوقیں بھی ہیں۔ کارتوس بھی ہیں۔ پہلوان بھی ہیں پھر بھی دیس اور بھلائی کے لئے ہم جنگ نہیں چاہتے امن چاہتے ہیں۔ اس لئے سیٹھ قی لال نے کہا کہ اگر آپ لوگ کنوئیں پر اُس کا حق مان لیں تو وہ آپ کو صرف آنے میں پانی کا گلاس دینے کا یہ خاص رعایت ہے آپ کے لئے"

"نہیں نہیں، سینکڑوں لوگ چلا اٹھے، ہمیں رعایت نہیں چاہیئے۔ ہمیں حق چاہیئے۔"

"صرف ایک آنے میں پانی کا گلاس ملے گا" حاجی علیلے چلایا۔

"نہیں۔ نہیں چاہیئے" لوگ آگے بڑھنے لگے۔

اُدھر سے سیٹھ پوتی لال چلایا "اچھا ان سے کہہ دو دو پیسے گلاس دے دیں

حاجی عیسےٰ بولا ،، آج سے مزید رعایت کی جاتی ہے ۔ دو پیسے گلاس بھائیو!
دو پیسے گلاس ۔ صرف دو پیسے گلاس

مگر اس کی آواز ہجوم کی ،، نہیں ،، میں دب گئی ۔ ہجوم آگے بڑھ گیا بالکل بے قرار ہو لوگ بھاگنے لگے ۔ انہوں نے جمال کے کہنے کے باوجود اپنی لکڑیاں چھوڑ دیں اور پلہ بول کر سیٹھ پوتی لال کے آدمیوں کی طرف بڑھ گئے ایک ایک پہلوان پر پچیس پچیس آدمی چل پڑے کسی نے ٹانگ پکڑی کسی نے بازو کسی نے سر کھول دیا چند منٹوں کی بلیاں رہیں میدان صاف تھا لوگ کنوئیں پر تھے اور سیٹھ پوتی لال اور اس کے ساتھی یا تو صحیح سلامت بھاگ گئے تھے یا زخمی ہو کر زمین پر کراہ رہے تھے ڈاکٹر کا متھ اور جمال اور دوسرے لوگ ادھر ادھر بھاگتے ہوئے سیٹھ کے آدمیوں کو چھڑانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ایسا نہ ہو غصے میں آ کر کہیں انہیں جان سے مار بیٹھیں ۔ لوگوں نے پستول اور بندوقیں سب لی تھیں اور انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے رکھ دیا تھا ۔ بیں کے پیڑ کے نیچے تھوڑے ہی میں کنوئیں کی چرخی گھومنے لگی اور ڈول سے پانی نکال کر لوگوں کو پلایا جانے لگا ۔ فضول اور ٹیکس کے اور بغیر کسی قیمت اور منافع کے لوگ پانی پی رہے تھے اور لار تھے اور ہنس رہے تھے ۔ اور گا رہے تھے پانی ان کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا اور ان کے منہ اور ان کے سینوں سے وہ اس پانی کو اپنی کانپتی ہوئی ہتھیلیوں میں لیکر اسے آنکھوں سے لگانے لگے اپنے رخساروں سے چھونے لگے اور آخر مست ہو کر اسے پر چھینٹے پھینکتے تھے ۔ ایک عجیب سرمستی اور خوشی کا عالم تھا ۔

یکایک بہاری نے گھونسا تان کے کہا یارو : اس سیٹھ پوتی لال کا کیا ہو لوہے کی ایک موٹی سلاخ لئے سیٹھ کے سر پر کھڑا تھا اور سیٹھ ندی کے ایک پتھر پر

سے کانپ رہا تھا۔

لوگ بہاری کیطرف دیکھنے لگے کبھی وہ پوتی لال کیطرف دیکھتے کبھی بہاری کیطرف

"بس یہی ایک فساد کی جڑ ہے" بہاری۔ سلاخ اٹھا کے کہا۔ کہو تو مار دوں اس کے سر پر؟ قصہ پاک ہو جائے"

جمال نے کہا۔ نہیں نہیں۔ ہمیں کنوئیں سے مطلب ہے کنواں مل گیا ہم کسی کی جان نہیں لینا چاہیئے"

"مگر یہ تو بندوق کا رعب دکھا رہا تھا"

"اسے تو ہماری جانوں سے پیار نہ تھا"

"آٹھ آنے میں پانی کا گلاس بیچ رہا تھا"

"اور پوری اور آلو کی قیمت بھول گئے؟"

"مار و سالے کو"

نہیں نہیں۔ نہیں بھائی" جمال ہاتھ اٹھا کے بولا" اب جانے دو۔ کنواں ہمارے بس ہے۔ پہلے ہم اس کے رحم و کرم پر تھے اور اب یہ ہمارے رحم و کرم پر ہے"

"اس نے ہم پر رحم کھایا جو ہم کھائیں؟" بہاری غصّے سے بولا۔ اگر اسکی جان لیتے ہو تو اسے کم از کم ایسی سزا دو جسے یہ زندگی بھر یاد رکھے"

"اسے کنوئیں میں الٹا لٹکا دو" تاج دین بولا۔

"ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے"

"بس بالکل ٹھیک ہے، اسے لٹکاؤ کنوئیں میں"

بہاری ہنسنے لگا۔ اسے یہ تجویز بے حد پسند آئی اس نے لوہے کی سلاخ پھینک دی۔

اور سیٹھ کا کان پکڑ کے اٹھانے لگا۔ پوتی لال کانپتے ہوئے اٹھا ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا " رحم کرو پرماتما کے لئے مجھ پر دیا کرو!

بہاری نے اسکے سر پر ایک زور کا دھپ دیا دھرم کا واسطہ دیتا ہے اس وقت کہاں مر گیا تھا؟ جب لوگ پیاس سے چلا رہے تھے"

بہت لوگ ایک دم اٹھے۔ جمال منع کرتا رہا۔ مگر کسی نے اسکی بات نہیں سنی۔ ان لوگوں نے سیٹھ کو رسی سے باندھ دیا اور پھر کی سے نیچے دھکیل کر کنوئیں میں لٹکا دیا

" میرا پتی ہے!" سیٹھ کی بیوی زار و قطار روتے ہوئے بولی اور بہاری کے پاؤں پکڑنے لگی۔

بحریا نے جمال کے پاؤں پکڑے مگر لوگ اسوقت جوش انتقام سے بھرے ہوئے تھے۔ کسی کی بات سننے کو تیار نہ تھے اندر کنوئیں میں سیٹھ لٹکا ہوا چلا رہا تھا " میں گیا بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ آزاد کر دو۔ میں قسم کھاتا ہوں گنگا مائی قسم جو آئندہ سے ایسا کام کروں اے بھگوان!"

" ہے تو یہ پاپی مگر اسے معاف کر دو" پنڈت جی نے بہاری کے سامنے جوڑ کر کہا " دیا دھرم کا مول ہے"

" اور سیٹھ کا سنیما پاپی سارے جھگڑوں کی جڑ ہے" بہاری بولا " پنڈت ذرا اسے تھوڑی دیر اور لٹکا رہنے دیجئے"

" نہیں بھائی! یہ خوف سے ہی مر جائے گا اتنا موٹا اور بزدل آدمی ہے" پنڈت جی نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

آخر جمال اور دوسرے آدمیوں کے بیچ میں پڑنے پر بہاری اور دوسرے

کنوئیں سے باہر نکالنے پر راضی ہوئے سیٹھ کو آہستہ آہستہ اوپر کھینچ لیا گیا جگت سے نیچے اتار کے اسکی رسیاں کھولی گئیں۔ سیٹھ کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور وہ طوفان سے اکھڑے ہوئے ٹھنٹھ کیطرح رہ رہ کر کانپ رہا تھا اور اسکی زبان سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے بڑی مشکل سے رک رک کر اس نے آہستہ سے پانی مانگا۔

"پا آ آ نی — !"

پنڈت جی جلدی سے پانی لانے دوڑے کنوئیں سے پانی نکالا گیا ایک گلاس پانی کا بھر کے سیٹھ کے سامنے لایا گیا پانی کو دیکھکر سیٹھ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اس نے پانی لینے کیلئے ہاتھ بڑھایا لیکا یک بہاری نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا سیٹھ کی آنکھیں مایوسی سے بجھتی معلوم ہوئیں۔

بہاری نے کہا "سیٹھ اس گلاس کی قیمت پانچ روپے ہے"

"پانچ روپے۔ لے لو" سیٹھ نے جیب سے پانچ روپے نکالتے ہوئے کہا

"نہیں دس روپے!" بہاری چلایا"

"اچھا بھائی! دس روپے لے لو"

بہاری نے کہا "نہیں ہم تو سو لیں گے"

سیٹھ کا گلا خشک ہو رہا تھا اسکے جسم کا رواں رواں پانی کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی بے قراری سے پانی کے گلاس کیطرف ہاتھ بڑھا کے کہا "سو کیا۔ ایک ہزار اسوقت مجھ سے لے لو"

سیٹھ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے روپے نکالنے لگا۔ ایک ہزار کے نوٹ

"نہیں، دس ہزار!" بہاری نے چلا کے کہا۔

"دس ہزار میرے پاس نہیں ہے مگر یہ دیکھو۔ جتنے میرے پاس ہیں وہ سب لے لو" سیٹھ نے اپنی جیبیں نوٹوں سے خالی کرتے ہوئے کہا "یہ لو۔ یہ لو۔ یہ لو مگر پانی مجھے دے دو پانی۔ بھگوان کے لئے پانی"

بہاری نے نوٹوں کیطرف دیکھا پانچ سات ہزار کے نوٹ ہونگے پھر اس نے اپنے پھٹے ہوئے کوٹ اور قمیض کیطرف دیکھا اس پاجامے کیطرف جس میں جگہ جگہ چیتھڑے لگے ہوئے تھے اس نے اپنے میلے کچیلے ہاتھوں کی طرف دیکھا گرد وغبار میں اٹے ہوئے ننگے پیروں کیطرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنی داڑھی کو زور سے کھجایا اور دانت پیس کر بولا۔

رکھ لو ان نوٹوں کو مجھے تمہارے یہ نوٹ نہیں چاہئیں میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ غریب لوگ کسطرح قحط میں بھوکے اور پیاسے مرتے ہیں کبھی کبھی عورتیں کیوں عصمت بیچتی ہیں" اس نے پانی کا گلاس سیٹھ کے ہاتھوں میں دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

جمال نے محبت بھری نگاہوں سے بہاری کیطرف دیکھا اسکا دل بھر آیا۔ گلا رُندھ گیا۔ اور ایک عجیب خوبصورت جذبے سے متاثر ہوکر اس نے بہاری کو اپنے گلے لگا لیا۔

نریندر نے جھٹکا دے کر کہا "غلام رسول! اب تو خدا کے لئے میری رسی کھول دے میں کہیں بھاگ نہیں جاؤں گا"

غلام رسول اس سے کچھ جواب میں کہنے والا تھا۔ کہ ایک گرجدار گونجتی آواز ان کے پیچھے آئی۔

"ہینڈز اپ"

غلام رسول نریندر، اور ساحکماری تینوں نے فوراً گھوم کر دیکھا ریوالور کے د

ان کے سینے کی طرف تھے۔

چار آدمی راجپوتی پگڑیاں باندھے اور ڈھاٹے لگائے، ریوالور ہاتھ میں کھڑے تھے۔ یکایک دوسری طرف سے آواز آئی "ہینڈز اپ"

تین آدمی کنوئیں کے اس طرف ایک اونچی چٹان پر کھڑے وہاں کے لوگوں کے ہاتھ اونچے کرا رہے تھے۔

پھر تیسری طرف سے آواز آئی "ہینڈز اپ" نریندر نے گھومے بغیر آنکھ کے کونوں سے دیکھا کہ پانچ چھ آدمی بھی اسی طرح راجپوتی پگڑیاں باندھے ہاتھوں میں بندوقیں لئے کھڑے ہیں۔ نریندر کی نگاہ پیپل کیطرف گئی جہاں خود ان کی بندوقیں اور اسلحہ رکھے تھے۔ مگر وہاں بھی دو آدمی موجود تھے ایک ان میں سے زیادہ لانبا اور مضبوط تھا۔ اسکا رنگ سانولا تھا۔ آنکھیں بڑی چمکیلی۔ اور مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح مڑی ہوئی۔ وہ اپنے کندھے پر ایک رائفل لٹکائے ندی کے پتھروں کو بڑی پھرتی سے پھلانگتا ہوا کنوئیں کی جگت پر چڑھ گیا اور اپنے چاروں طرف ان لوگوں کو دیکھنے لگا جنہیں اسکے ساتھیوں نے اپنی بندوقوں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

اسے کنوئیں کی جگت پر چڑھتے دیکھ کر بڈھے کسان نے زور سے سانس اندر کھینچ کر خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ڈاکو جیت سنگھ!"

بڈھے کسان نے گو بہت آہستہ آہستہ سے یہ الفاظ کہے تھے لیکن اس پاس کے حیرت زدہ لوگوں نے، خود جیت سنگھ نے ان الفاظ کو سن لیا جیت سنگھ آہستہ سے مسکرایا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو بل دیکر کہا ہاں بڈھا دھولا سنگھ ٹھیک کہتا ہے میں ڈاکو جیت سنگھ ہوں۔

ہجوم میں یہ اطلاع ایک بجلی کی سی سرعت کیساتھ دوڑ گئی۔ چہرے مایوس، خوفزدہ اور ہراساں نظر آنے لگے۔ سیٹھ پوتی لال نے ہاتھ جوڑے اور ڈر اور خوف سے بالکل بچوں کیطرح روتے ہوئے کہنے لگا "میرا سب کچھ لے لو مگر میری جان بخشی کردو ہے مہاراج" وہ کنوئیں کی جگت پر ڈاکو کے قدموں پر سر جھکا کر ڈھاریں مار مار کر رونے لگا اسے موت بالکل اپنے سامنے نظر آرہی تھی۔ ڈاکو جیت سنگھ نے پاؤں کی ایک ٹھوکر پوتی لال کے سر پر لگائی پوتی لال اوندھا ہو کر جگت سے ندی کے پتھروں پر جا گرا۔

گو ہوا بالکل نہ تھی مگر پھر بھی حاجی علیئی کی داڑھی ایسے ہل رہی تھی گویا وہ کسی تیز پنکھے کے سامنے بیٹھا ہو وہ رندھے ہوئے لہجے میں دو متضاد سروں میں آواز نکالتا ہوا بولا "میں۔ میرے پاس کل پانچسو روپیہ ہے ایک ہیرے کی انگوٹھی ہے تم یہ سب لے لو مگر میرے جان نہ لو میں نے ابھی دوسری شادی کی ہے"

ڈاکو جیت سنگھ مسکرایا اس نے پھر اپنی مونچھوں کو بل دیا بولا "میں ڈاکو ضرور ہوں۔ مگر کسی کی جان نہیں لیتا نہ میں کسی کی دولت چاہتا ہوں۔ تجھے جو کچھ لینا ہوگا وہ خود لے لوں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ جگت سے نیچے کود گیا اور مختلف ٹولیوں کو غور سے دیکھتا ہوا چلنے لگا۔ وہ ڈاکو ریوالور تانے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے وہ ہر ٹولی کو بڑے غور سے دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نریندر کی ٹولی کے سامنے رک گیا نریندر کے ہاتھوں میں ہتھکڑی دیکھ کر غلام رسول سے پوچھنے لگا۔

"کون ہے یہ؟"

"چور!"

جیت سنگھ نے نریندر کی طرف غور سے دیکھا اسکے مضبوط جسم کی طرف اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کے شانوں کی سختی کا اندازہ کیا۔ پھر سر ہلا کر اور مسکرا نریندر سے پوچھا۔

"تم نے چوری کی؟"

نریندر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہارا نام؟"

"نریندر!"

غلام رسول سے مخاطب ہو کے جیت سنگھ نے کہا۔

"اس کی ہتھکڑی کھول دو"

غلام رسول نے ایک لمحے کیلئے توقف کیا۔ مگر پھر پستول کی نالی دیکھ کر اس نے فوراً نریندر کی ہتھکڑی کھول دی۔

ڈاکو نے نریندر سے کہا۔ "ہمارے ساتھ چلے گا؟"

"نہیں!" نریندر نے سر ہلا کر بڑی مضبوطی سے انکار کر دیا۔

ڈاکو حیران ہوا۔ مگر کچھ نہیں بولا۔ اس نے مسکرا کر رُخ بدل دیا راجکماری کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کہو کرشنا باقی کیسی ہو؟"

راجکماری نے بڑی نفرت سے ڈاکو کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اچھی ہوں"

مگر تمہیں یہاں تو بہت تکلیف ہو رہی ہوگی مجھے پتہ چلا ہے۔ اس عادت

گا۔ میں ان دنوں دربار واڑہ گیا ہوا تھا ایک کام کو۔ ورنہ اب تک حاضر ہو جاتا بیٹھو دو ایک روز ہمارے گھر مہمان رہو۔ ایسا موقعہ پھر کب آئے گا"

"نہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں" راجکماری نے بڑی جرأت سے کہا۔

"نہیں تمہیں تو ضرور چلنا ہوگا کرشنا بائی آخر میں تمہارے باپ کا نمک خوار جاگیردار ہوں۔ کیا ہوا اگر اس نے میری جاگیر ضبط کر لی۔ تم میرے علاقے میں آئی ہو تمہاری مہمان داری میرا فرض ہے"

جیت سنگھ نے ہنس کر اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ نریندر فوراً آگے بڑھا جیت کے ساتھ کے دونوں ڈاکوؤں نے اسے سنبھال لیا اس کے دونو طرف پسلیوں میں پستول رکھ دیئے۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی" راجکماری بے بس ہو کر چلا رہی تھی ڈاکو نے ہنستے ہوئے اسے اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ اور بجریا کی طرف اشارہ کر کے بولا "تم بھی چلی آؤ۔ ایک راجکماری کو لے جا رہا ہوں آخر اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک عورت بھی تو چاہیئے۔ دیدار گڑھ کے مہاراج کیا کہیں گے میں ان کی بیٹی کو لے گیا اور اس کی خدمت کے لئے ایک نوکرانی بھی میرے پاس نہ تھی بس چلی آؤ" ایک ڈاکو نے بجریا کو بندوق کے کندے سے ہلایا۔ کیونکہ وہ تو بالکل پتھر کا بت بنی خاموش کھڑی تھی کندہ لگتے ہی جیسے اسے ہوش آگیا وہ چونکی اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر ڈاکوؤں کے ساتھ چلنے لگی۔

پانچ چھ ڈاکو اپنے سردار جیت سنگھ کے ساتھ ہو لئے باقی وہیں بندوقیں اور ریوالور تانے کھڑے رہے۔ جیت نے آگے جا کے اپنا بوجھ ایک دوسرے ڈاکو کو دے دیا جس نے راجکماری کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ وہ سب سامنے کی پہاڑی پر جا رہے تھے۔

نریندر کے چہرے پر پسینہ پھوٹ نکلا وہ کسمسایا۔ اس نے پستول کی نالیوں کو بڑی شدت سے اپنی پسلیوں پر محسوس کیا وہ پھر خاموش کھڑا رہ گیا ڈاکوؤں کا گروہ آنِ واحد میں پہاڑی کی اُونچی اُونچی چٹانوں کے پیچھے غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ساتھ تین گولیوں کے چلنے کی آواز آئی نریندر کا دل بری طرح دھڑکا لوگوں کے چہرے فق ہوگئے۔ یکایک ندی میں کھڑے ہوئے ڈاکوؤں نے بھی اپنی بندوقیں سیدھی کیں اور ہوا میں تین فائر کئے۔ پستول کے نیچے رکھے ہوئے ہتھیار اٹھائے اور پہاڑی کی طرف چلے گئے۔ اور چلتے چلتے کہہ گئے کہ اگر کسی نے ان کا پیچھا کرنے کی غرض سے اس پہاڑی کا رُخ کیا تو گولی سے اڑا دیا جائے گا تھوڑی دیر کے بعد ڈاکوؤں کا دوسرا گروہ بھی پہاڑی کی بلند و بالا چٹانوں کے پیچھے غائب ہوگیا اب یہ بلند سنگلاخی پہاڑی اپنے سینے میں خطرناک ڈاکوؤں کو چھپائے بظاہر بڑی معصوم و سادہ نظر آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ڈاکو کہیں تھے ہی نہیں کہیں سے آئے ہی نہ تھے کہیں گئے ہی نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے یہ سب کچھ ایک چھلاوہ تھا۔ نریندر کو یقین نہ ہوتا تھا کہ واقعی اب سے چند لمحے پیشتر ڈاکو یہاں موجود تھے۔ اور وہ ان کے سر پر بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ مگر جب اُس نے اس جگہ کی طرف دیکھا جہاں راجکماری کھڑی تھی اور جہاں اب کوئی نہ تھا۔ تو اُسے یقین آیا۔ واقعی یہ سب کچھ ہوا تھا۔ وہ لوگ آئے تھے۔ اور راجکماری کو اٹھا کر لے گئے تھے اور وہ انہیں بچانے کے لئے کچھ نہ کر سکا تھا۔

شرم سے اُسکی گردن جھک گئی غم اور غصّے کے آنسو اُسکی آنکھوں میں چھلک آئے عین اسی وقت اس نے دیکھا کہ جہاں سے راجکماری کو ڈاکو جیت نے زبردستی اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا تھا وہاں سپید اور نیلے پتھروں کے درمیان کوئی

چیز چمک رہی ہے نریندر نے آگے بڑھ کر اور جھک کر دیکھا۔ راجکماری کا جڑاؤ کنگن تھا وہ دیر تک کنگن ہاتھ میں اٹھائے الٹ پلٹ کر اسے دیکھتا رہا اس کنگن میں ایک مُدوّر صندلی گولائی تھی ایک نازک کلائی کا خم تھا ایک ملائم بے داغ جلد کا گداز ملمس تھا نریندر نے اسے موت کے ہاتھوں سے چھین لیا تھا۔ مگر ایک ڈاکو کے ہاتھوں سے نہ چھین سکا۔ اُسے راجکماری کی شعلہ ریز نگاہیں یاد آئیں۔ اس کے بے بس ہاتھوں کا بلانا۔ اس کی "میں نہیں جاؤں گی" "کے اندر" کوئی مجھے بچائے" کی استدعا، اسکے کانوں میں گونجتی ہوئی معلوم ہوئی۔ یکایک اُس نے زور سے کنگن کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔

بڈھا کسان کہہ رہا تھا۔

" یہ جیت سنگھ ڈاکو ہے بڑا خطرناک اور ظالم ڈاکو ہے یہ اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ دو سال ہوئے یہ دیدار گڑھ میں ایک بڑا جاگیردار تھا کسی بات پر مہاراجہ سے ناراض ہو گئے اسکی جاگیر ضبط کر لی جب سے یہ ڈاکو بن گیا دور دور تک ڈاکے ڈالتا ہے بڑے بڑے زمیندار اور راجہ مہاراجہ تک اس سے ڈرتے ہیں۔

" تم یہاں رہتے ہو مگر اس سے ڈرتے نہیں؟ بہاری کسان سے پوچھنے لگا۔

" وہ غریبوں کو کچھ نہیں کہتا۔ الٹا ان کی مدد کرتا ہے" کسان بولا "اسلئے ہم بھی اس کی مدد کرتے ہیں اور پولیس کو اس کا پتہ وتہ کچھ نہیں بتاتے۔ ایک تو یہ علاقہ ہی اتنا دشوار ہے ریگستانی اور پہاڑی ہے کہ یہاں مشکل ہی سے کوئی پولیس کا آدمی پھٹکتا نہیں پھر اگر آتا بھی ہے تو اس پہاڑی پر چڑھنے سے پہلے ہی ڈاکو اُسے گولی کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ وہ اُوپر کو پہاڑی کے بیچ میں جو تم غار دیکھتے ہو نا۔ وہ اُوپر کو

ایسے ایسے کئی غار اس پہاڑ میں ہیں۔ یہاں یہ ڈاکو رہتے ہیں ان کو پکڑنا ناممکن ہے"
بڈھے کسان نے فیصلہ کن انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

نریندر نے جمال سے کہا" پانچ چھ سو آدمیوں میں سے پندرہ بیس ڈاکو ایک
لڑکی کو اٹھا کے لے جائیں اور تم سب لوگ چپ دیکھتے رہ جاؤ"

"تم بھی وہیں موجود تھے۔ تاج بولا نہ تم نے کیا کیا؟"

نریندر پہلے تو چپ رہے پھر بولا۔ اچھا نواب چلو راجکماری کو چھڑا لائیں"

"ہاتھ میں پتھر لے کے جائیں گے کیا؟ بہاری طنز کرکے بولا۔ دو چار بندوقیں
تھیں وہ بھی تو ڈاکو ساتھ لے گئے"

"بڈھے کسان نے کہا" سنا ہے ان کے پاس دو مشین گنیں بھی ہیں"

بہاری نے کہا" یہ ان کا نجی معاملہ ہے راجکماری کے باپ نے اس کی جاگیر
اٹھالی وہ اس کی لڑکی اٹھالے گیا، وہ لوگ آپس میں نپٹتے رہیں گے۔ ہمیں کیا"

نریندر بولا" سوال ایک جاگیر کا نہیں ہے۔ ایک لڑکی کی عزت کا ہے"

جمال نے کہا" میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں مگر کچھ نہیں ہوگا۔
راستے میں ہی گولی کا شکار ہو جائیں گے۔ اتنا کہہ کر اس نے اوپر پہاڑی کی طرف
دیکھا اور چلا کے بولا۔

"وہ دیکھو، وہ دیکھو۔ ڈاکو نظر آ رہے ہیں"

سینکڑوں لوگ پہاڑی کی طرف گھوم کر دیکھنے لگے۔ پہاڑی کے وسط میں،
جہاں سیاہ غاروں کے منہ کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ڈاکو آہستہ آہستہ اوپر چڑھتے
ہوئے نظر آئے پھر ایک ایک کرکے ان تاریک غاروں میں گم ہو گئے۔

حاجی علیلے نے کہا "مجھے تو اس بڈھے کی نیت پر شبہ ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے یہی ہم لوگوں میں جھگڑا ڈال کے یہاں سے آیا تاکہ ڈاکو آسانی سے راجکماری کو لے جاسکیں "

دلیپا ئی بولا " اور مجھے تو یہ چور بھی ڈاکوؤں سے ملا ہوا معلوم ہوتا ہے وہ ڈاکو اس سے کچھ پوچھ تو رہا تھا " دلیپا ئی نربندر کی طرف بڑی نفرت سے دیکھ کر بولا ۔

" ابی مجھے تو یہ سب ملی بھگت دکھائی دیتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ڈاکو نے ہی راجکماری کو پکڑنے کے لئے یہ شرین کا ایکسی ڈنٹ کرایا ۔ فلیش پلیٹ اکھاڑ کے پھینک دی ہو "

" کچھ عجب نہیں ہے " چنگن جو اب پٹھانوں کے پیچھے سے نکل کر ڈرتے ڈرتے واپس آگیا تھا ۔ بولا عجب نہیں ہے رات کو پھر یہاں ڈاکہ پڑ جائے "

" ہم لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں " کھنہ جوش سے چلا کے بولا ہمیں یہاں سے فوراً واپس چل دینا چاہیئے ۔ یہ تو ڈاکوؤں کی وادی ہے "

" مگر جائیں گے کہاں ؟ " جمال بولا ۔ یہاں کم از کم پانی کا کنواں تو ہے "

دلیپا ئی نے کہا ۔ کنواں تو ہے مگر جان تو ہر وقت خطرے میں ہے وہیں ریل گاڑی کی " ٹن پر واپس چلتے ہیں ۔ وہاں کم از کم ڈاکو اس پہاڑی کی طرح سر پر تو موجود نہیں ہوں گے "

" ہاں یہ ٹھیک ہے " پہاڑی نے سر ہلا کے کہا پھر وہاں اس طرح گھیرے میں نہیں لے سکتے ۔ جیسے اس چھوٹے سے جزیرے میں انہوں نے ہمیں لے لیا تھا ۔ وہاں کھلا میدان ہے "

ایسے ایسے کئی غار اس پہاڑی میں ہیں۔ یہاں یہ ڈاکو رہتے ہیں۔ ان کو پکڑنا ناممکن ہے۔" بڈھے کسان نے فیصلہ کن انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

نریندر نے جمال سے کہا "پانچ چھ سو آدمیوں میں سے پندرہ بیس ڈاکو ایک لڑکی کو اٹھا کے لے جائیں اور تم سب لوگ چپ دیکھتے رہ جاؤ۔"

"تم بھی تو وہیں موجود تھے۔" تاج بولا "تم نے کیا کیا؟"

نریندر پہلے تو چپ رہا۔ پھر بولا۔ اچھا تو اب چلو۔ راج کماری کو چھڑا لائیں۔"

"ہاتھ میں پتھر لے کے چلیں گے کیا؟" بہاری طنز کر کے بولا۔ "جو دو چار بندوقیں تھیں وہ بھی تو ڈاکو ساتھ میں لے گئے۔"

"بڈھے کسان نے کہا "سنا ہے ان کے پاس دو مشین گنیں بھی ہیں۔"

بہاری نے کہا "یہ ان کا جی معاملہ ہے۔ راجکماری کے باپ نے اس کی جاگیر اٹھائی وہ اس کی لڑکی اٹھا لے گیا۔ وہ لوگ آپس میں نپٹتے رہیں گے۔ ہمیں کیا؟"

نریندر بولا۔ سوال ایک جاگیر کا نہیں ہے ایک لڑکی کی عزت کا ہے،

جمال نے کہا "میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر کچھ ہو گا نہیں راستے میں ہی گولی کا شکار ہو جائیں گے۔" اتنا کہہ کر اس نے اوپر پہاڑی کی طرف دیکھا اور چلا کے بولا۔

"وہ دیکھو وہ دیکھو۔ ڈاکو نظر آ رہے ہیں۔"

سینکڑوں لوگ گھوم کر پہاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔ پہاڑی کی وسط میں جہاں سیاہ غاروں کے منہ کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ڈاکو آہستہ آہستہ اوپر چڑھتے ہوئے نظر آئے پھر ایک ایک کر کے ان تاریک غاروں میں گم ہو گئے

گارڈ بولا "اور بہت ممکن ہے آج رات سے پہلے پہلے ریلیف ٹرین آجائے"

کھڑک بولا "اور اگر ریلیف ٹرین بھی آ گئی تو وہاں آسکے گی - یہاں تھوڑی آسکے گی "

نرینیدر نے کہا " مگر وہ راجکماری . . . . "

کھڑک سنگھ بولا " ایسی ہی راجکماری کے حمائتی ہو تو خود جاکے چھڑا لاؤ ہمیں کیوں مصیبت میں ڈالتے ہو - تمہاری ایک راجکماری کے لئے کیا بارہ سو مسافر ڈاکوؤں سے خواہ مخواہ کی دشمنی مول لے لیں "

تاج الدین نے غصے سے کہا " یہ کہاں کی عقلمندی ہے ؟"

بہاری نے نرینیدر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا " بھائی وہ راجہ کی بیٹی ہے وہ خود اُسے چھڑا لے گا یہ علاقہ ہی خود اُس کی عملداری میں ہے کوئی میری اور تمہاری عملداری میں تو ہے نہیں کہ ہم بندوقیں .. ڈاکوؤں پر چڑھ جائیں "

اٹھارہواں باب

وہ ایک عجیب و غریب سب کے ملن کی رات تھی۔ ایسی رات اس نیلے آ
ویران ریگستانوں میں کم آتی ہے۔ جب ریتیلے ٹیلوں پر سبزہ پھوٹنے لگتا
سنگلاخی سطحوں کو چیر کر کونپلیں لہرانے لگتی ہیں اور سرد پر قبیلے سماج کی
ہو کی ڈالیاں محبت، عاصفت اور رواداری کے شگوفوں سے لد جاتی
اور وہ فرق معدوم ہونے لگتا ہے جو انسان کو انسان سے جدا کرتا ہے۔

آج کی رات سب ایک تھے امیر اور غریب دانش وزیر احمق، پہلوان
کمزور، شاعر اور لوہار سب ایک تھے۔ باہر کے خطرے نے سب کو اندر
مٹھی کی طرح متحد کر دیا تھا۔ موتی لال اور جمال، تاج الدین اور حاجی
بقرہ بلوائی اور دیبائی شکنتلا اور حمید چھکن اور گوپت سب ایک دوسرے سے گھل مل کر

درسوچ رہے تھے کہ اگر رات کو ڈاکوؤں نے حملہ کیا تو کس طریقے سے گاڑی
کے مسافروں کو اور اُن کے جان و مال کو ڈاکوؤں کی لوٹ مار سے بچایا جا سکتا ہے
بڑے بڑے کڑھاؤں میں پوریاں تلی جا رہی تھیں، پھولی ہوئی پوریاں تیل
کی سطح پر سنہری بطخوں کی طرح تیر رہی تھیں ایک کڑھاؤ میں آلو مسالے میں سرخ کیے
جا رہے تھے۔ ایک طرف عورتیں سبزی کاٹ کے بھاجی تیار کرنے میں مصروف
۔ دوسری طرف حاجی عیسے کی نگرانی میں روغن جوش تیار ہو رہا تھا اور بھنے
ہوئے گوشت کی اشتہار انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آج حاجی عیسے
نے کسان سے بکریاں خریدنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔

آج چاروں طرف ریت پر مشترکہ دسترخوان بچھے تھے، نربدا اور شکنتلا پنڈت
کی بیوی کے ساتھ ننگے پاؤں گھوم کے سب کو پوریاں بانٹ رہی تھیں سیٹھ پونی
لال اپنی دھوتی سنبھالے ہوئے آلو کی بھاجی اُٹھائے خود سب کو پوری اور
بھاجی اور اپنی مسکراہٹ تقسیم کر رہے تھے۔

موتی لال بہاری سے باتیں کر رہا تھا۔ بہاری اُس سے کہہ رہا تھا بچا ہم پچاس کی
چھ ٹولیاں بنائیں۔ جو باری باری سے پہرہ دیں گی۔ رات بھر پہرہ رہے گا کل دن کو
رہے گا۔ اس وقت تک رہے گا سیٹھ جب تک ریلیف ٹرین نہیں... تی
تک آئے گی؟ کم بخت یہ ٹرین آ ہی نہیں چکتی"

موتی لال ریل کی پٹری کی طرف دور تک دونوں طرف دیکھ کے خاموش
ہے تم فکر کیوں کرتے ہو سیٹھ! ہمارا تمہارا پانی کا جھگڑا تھا۔ وہ ختم ہو گیا اب تم فکر
۔ پہلے کوئی ہماری جان لے گا پھر تمہاری، ہم پتھروں کی کواری میں کام کرتے ہوئے

مزدور ہیں، ہر روز بارود اور فیتے سے کھیلتے ہیں۔ موت سے نہیں ڈرتے۔"

"تم کس کی کواری میں کام کرتے ہو؟"

"سیٹھ سرموریا کی کواری میں۔"

"ارے ---!" پوتی لال نے حیرت سے چلّایا "وہ تو میری اپنی کواری ہے۔"

"تمہاری کواری ہے"

"ہاں سرموریا تو صرف ایک تہائی حصے کا مالک ہے۔ دو تہائی حصے کا میں ہوں جو چاہے کر سکتا ہوں۔ کہو تو میں تمہیں کواری کا منیجر بنا دوں۔"

"مجھے لکھنا پڑھنا تو آتا نہیں۔" بہاری نے مشکوک لہجے میں سیٹھ پوتی لال کی دیکھ کے کہا "پھر تم مجھے منیجر کیسے بنا دو گے؟"

"ارے تمہاری مدد کے لئے ایک منشی رکھ دوں گا۔ آہستہ آہستہ تم لکھنا پڑھنا بھی سیکھ جاؤ گے۔"

بہاری نے اپنے کھردرے سخت ہاتھوں کی طرف دیکھا جن کی پشت پہ مسلسل پتھر توڑنے سے نیلی وریدیں اور شریانیں ابھر آئی تھیں، یہ ہاتھ قلم کیسے پکڑیں گے بہاری نے مایوسی سے سر ہلایا۔ بولا میں مزدور ہی ٹھیک ہوں مجھ سے منیجری نہیں ہوگی۔ زندگی بھر کولہو کے بیل کی طرح تمہارے لئے کام کرتا رہا ہوں اب تو دماغ بھی پتھر کی طرح سخت ہو گیا ہے۔

بہاری نے اپنے گنگ ہن لکھیا کے بارے میں سوچا اس کا سوکھا ہوا تنومند جسم، بھوکی خوفزدہ آنکھیں، گھٹنوں سے اوپر پھٹی ہوئی نیکر، سر کے بال اُڑے اُڑے اور پتھر کے باریک ذروں میں اٹے ہوئے۔ یہ گنگ ہن لکھیا تھا جو پیٹ بھرنے سے پہلے تھوڑا

اور یو سلنے کے بعد شیطان کا ساتھی معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی زبان کِس قدر۔ تیز اور گالیوں سے آلودہ ہوتی تھی کتنی سختی سے وہ اپنے گنگ کے مزدوروں سے کام لیتا تھا بہاری نے کئی بار سوچا تھا کہ اُسے جان سے مار دے مگر کھالکے بھی آٹھ بچے تھے اور ایک بیوی تھی۔ اور ایک بے حد بوڑھی ماں اور وہ سب لوگ اُس کی کمائی پہ جیتے تھے۔ کھالکے قتل کے بعد اُن کا کیا ہوگا؟ اور کھیا بھی کیا بُرا تھا اگر وہ مزدوروں سے سختی سے کام نہ لے۔ تو منیجر اُسے دوسرے ہی دن کواری سے باہر نکال پھینکے

بہاری نے انکار میں سر ہلا کے کہا "تانا سیٹھ مجھے گنگ مینی بھی منظور نہیں تمہیں اگر میری مدد ہی کرنی ہے تو ہم سب کی مدد کرو۔ کواری کے سب مزدوروں کی تنخواہ آٹھ آنے روز بڑھا دو آٹھ آنے کچھ نہیں ہوتے سیٹھ تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ مگر ہمارے چھوٹے چھوٹے گھروں میں کتنی خوشی آجائے گی۔ کسی کے کان کی بالی آئے گی اور کسی کے بچے کی اسکول کی فیس آئے گی۔ کوئی زندگی میں پہلی مرتبہ دو روٹیاں کھائے گا اور کسی کے گھر میں سیٹھ پہلی مرتبہ کوئی رنگین اوڑھنی آئے گی تمہیں معلوم نہیں ہے سیٹھ تم یہ آٹھ آنے روز بڑھا کے کتنے معصوم دلوں کی دعا لوگے"

پوتی لال کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولا سچ سچ میں کتنا ظالم ہوں۔ تم ایسا کرنا جانے سے پہلے مجھ سے کواری کے منیجر کے نام ایک رقعہ لیتے جانا۔ سو وہ اسی دن کواری کے مزدوروں کی تنخواہ آٹھ آنے بڑھا دے گا۔ بھگوان نے مجھے بہت بہت دیا ہے ایک سو ساٹھ مزدوروں کو آٹھ آنے روز زیادہ دینے سے میرا کچھ نہیں بگڑیگا"

حاجی عیسٰی نے تاج دین سے کہہ رہے تھے تو تم جانتے ہو آج کل زمانہ ایک لوہار کا نہیں۔ ہے۔ دربار واڑہ یا اُس سے بھی آگے اُدھم پور میں جا کے تم کتنا کما لوگے؟"

"نہ ساٹھ ستّر روپے تو بھی جائیں گے۔" تاج الدین پُراُمید لہجے میں بولا "یہاں اپنے گاؤں میں تو بیس بھی نہیں ہوتے"۔

حاجی عیسیٰ نے تالو سے زبان چٹخائی اور کہا "ساٹھ ستّر بھی کیا ہوں گے۔ کم سے کم ڈیڑھ سو روپے تو ہونے چاہئیں"۔

"ہونے کو تو دو سو بھی کم ہیں۔ مگر سوال یہ ہے ہوں کہاں سے؟" لوہار مسکرا کے بولا۔

حاجی عیسیٰ نے اپنی "جگّی" داڑھی پہ ہاتھ پھیر دو ایک بار لیکن ہاتھ میں کوئی بال نہیں آیا سوچ سوچ کر بولے "بھائی میرے! میں نواب اکیلے لوہاری کے کام پہ بھروسا نہیں رکھتا ہوں میرا ارادہ ایک آئرن فونڈری لگانے کا ہے مشینری کے لئے ولایت آرڈر دے رکھا ہے۔ اگلے مہینے مشینری آجائے گی، پھر مجھے ڈیڑھ سو لوہاروں کی ضرورت پڑے گی۔ چھوٹے کام میں کبھی یقین نہیں رکھتا مگر نیا نیا کام ہے پھونک پھونک کے قدم رکھوں گا۔ کسی لوہار کو ایک سو پچیس روپے سے زیادہ پگار نہیں دوں گا"۔

"ایک سو پچیس روپے!؟"

تاج الدین کے ذہن میں ایک سو پچیس نوٹوں کی تلا رسی پھیلنے لگی، کتنے ہوتے ہیں ایک سو پچیس روپے اُس نے اپنی زندگی میں پانچ روپے دیکھے تھے دس روپے دیکھے تھے اور بیس روپے دیکھے تھے مگر اس سے زیادہ روپے اُس کے ہاتھوں نے کبھی یکمشت نہیں دیکھے تھے ایک سو پچیس روپے! باپ رے باپ غریبی اور نادری اور مایوسی کے خلاف کتنی لمبی جاندہ تھی۔ یہ ایک سو پچیس میل تھی ایک سو پچیس گز اونچی ایک سو پچیس ہم

کھڑی کتنی مضبوط دیوار تھی یہ گردن اٹھا کے دیر تک اپنے احساس میں اس پھیلی ہوئی کھڑی ہوئی ہوئی اونچی دیوار کو دیکھتا رہا۔ میلوں میلوں ہی میلوں تک یہ دیوار، دیوار چین کی طرح پھیلتی جا رہی تھی اور فاتحوں اور حملہ آوروں کی خون آشام فوج کو اندر آنے سے روک رہی تھی۔

تاج الدین کا چہرہ مسرت اور تشکر کے احساس سے روشن ہو گیا اس نے بڑی محبت سے حاجی عیسٰے کا ہاتھ دبایا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ حاجی عیسٰے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بڑی شفقت سے کہا۔

"تم میرے مسلمان بھائی ہو"

دیہاتی جمال سے کہہ رہا تھا تو چھوڑو بھائی۔ کیا تم دل سکھ بھائی کے گراج میں پڑے ہو میرے بھائی شگن چند کا اپنا گراج ہے بمبئی میں ستر آدمی کام کرتے ہیں۔ تم وہاں آجاؤ۔ میں شگن چند سے کہہ کے تمہیں وہاں ہیڈ مکینک کی پوسٹ دلوا دوں گا۔ ساڑھے چار سو روپے تنخواہ ملے گی اور ہر سال پندرہ روپے ترقی۔ اور کیا چاہیئے ؟"

ساڑھے چار سو روپے! "حمیدہ یہ باتیں سنتے سنتے اندر ہی اندر مسکرائی کوئی اس کا دل ٹٹولنے لگا کتنی ہی صدیوں کی ہزاروں برسوں کی سوئی ہوئی آرزو ... یک سر اٹھا کے چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ ساڑھے چار سو روپے! اپنا ایک چھوٹا سا خوب صورت مکان برآمدے میں عشق پیچاں کی محراب اور بیلیں اندر سے اور صوفے پنکھے اور شمعدان کتنے ہی خوب صورت نرم نرم گداز غالیچے اس دل کے فرش پر بچھتے گئے، اس کے خیال کی کھڑکیوں میں کتنے ہی حریری پردے

لہرانے لگے کتنی ہی ساریوں کے قوس قزحی رنگ اُس کی آنکھوں میں کھلنے لگے
اور وہ جو سال بھر میں ایک اوڑھنی ایک قمیض اور ایک شلوار سلایا کرتی تھی یکایک
ریشمی کپڑوں سے سج گئی، سنہری زیوروں سے لدگئی اور ایک نازک خوشبوؤں سے
مہک گئی - کہاں چھپی ہوئی تھیں اُس کے دل کے اندر یہ آرزوئیں؟ اُس کی
زندگی کا آسمان اس قدر سیاہ تھا - اُس کے پاؤں کے نیچے کی زمین اسقدر سنگلاخ
تھی کہ اُس نے بھولے سے بھی ایسا خواب نہ دیکھا تھا - خواب نہ دیکھا تھا؟
پھر کہاں سے، دل کی گہرائی سے اُچھل کر اُمنگیں اور آشائیں جل پریوں کی طرح
اوپر آگئی تھیں اور اُس کے احساس کی جھیل میں اس غرور اور رعنائی سے
تیر رہی تھیں جمیلہ کی آنکھیں ایک دلفریب دھندلکے میں کھو گئیں -

بیج نہیں مرتا ہے انسان کے دل کا بیج نہیں مرتا ہے، کوئی ایک دن ظلم کرتا ہے
اور کوئی ایک سال ظلم کرتا ہے اور کوئی ہزار سال ظلم کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اُس نے
انسان کے اندر اُس بیج کو مار ڈالا، اُسے کچل کر پھینک دیا - اُسے پیس کر مٹی میں
اُس کی ہستی مٹادی، اُسے ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر دیا - مگر یہ بیج نہیں مرتا ہے
اسے جتنا دباؤ، جتنا پیسو، جتنا کچلو یہ اندر سے اور مضبوط ہوتا جاتا ہے اور بیج
جاتا ہے اندر سے لوہے کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے اور جب کبھی بہار کا ہلکا سا
جھونکا بھی اُسے چھو جاتا ہے تو یہ ایک بیج شجر کی طرح اُچھل کر اُن کے سینے
سینہ نکلتا ہے لہلہا کر بہار آتی -

ظالم ہمیشہ یہی غلطی کرتے ہیں - وہ کچلے ہوتے پسے ہوئے انسانوں کی اوپر کی
بے رنگ زندگی دیکھتے ہیں اندر کا بیج نہیں دیکھتے ہیں اندر کا بیج نہیں دیکھتے

مگر نریندر!! اس محبت بھری رات میں وہ بالکل اکیلا تھا خوبصورت پیشوں بھرے میلے میں وہ بالکل تنہا تھا۔ اکیلا، اُداس، مایوس اور افسردہ وہ راجکماری کو اٹھا کے لے گئے تھے اور بھریا کو اُٹھا کے لے گئے تھے۔ اور یہ لوگ اُن دونوں کی زندگیوں اور اُن کے انجام سے بے خبر اور بے نیاز یہاں کھا رہے تھے۔ پی رہے تھے۔ گنگنا رہے تھے۔ بانہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہے تھے اور وہ اکیلا بیٹھا رہا۔ یہ لوگ اس قدر سنگ دل کیسے ہو سکتے ہیں؟ اُس کا دل رونے کو چاہا مگر اُس کی آنکھیں بالکل بے نم تھیں جیسے اندر سے آنسوؤں کا سوتا خشک ہو گیا ہو اور ریت ہی ریت باقی رہ گئی ہو۔

آج کسی نے اُسے پیار سے نہیں بُلایا۔ کسی نے اُس کی رہبری قبول نہیں کی کسی نے آج اُسے کھانے کے لئے نہیں پوچھا۔ صرف غلام رسول نے اُسے کھانے کے لئے پوچھا تھا جیسے ایک نگراں ایک قیدی سے پوچھتا ہے۔ اور اُس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ آج اُس کی بھوک غائب تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے کیوں وہ لوگوں سے خفا ہے۔ جن کے لئے راجکماری کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اور اگر رکھتی تھی تو غم، مایوسی، تاریکی اور ظلم کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتی تھی وہ کیوں لوگ راجکماری کے لئے پریشان ہوتے راجکماری ان کی کیا تھی؟ تمہاری کیا ہے۔ نریندر! یہ کیسی بے چینی بے مقصد، فضول، نکمی، ناممکن سی چاہت ہے، نریندر! چاہت بھی ہے کہ نہیں ہے، چاہت ہے کہ کیا ہے؟ اس کا کیا انجام ہونے والا ہے، مگر چاہت نے کبھی انجام کو سوچا ہے، کبھی مقصد کو ڈھونڈا ہے، چاہت میں دانشمندی اور دوراندیشی کیسی چاہت کوئی بنئے کی ترازو

نہیں ہے کہ اس پلڑے میں اپنے آپ کو ڈالا، دوسرے پلڑے میں محبوب کو ڈالا کانٹا
برابر ہو گیا۔

چاہت میں کوئی ہیرا پھیرا نہیں ہوتا۔ اور کوئی پلڑا نہیں ہوتا، صرف ایک کانٹا
ہوتا ہے جو برابر دل میں چبھتا رہتا ہے۔

نریندر نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ اور نیم کے پیڑ تلے دراز
ہو گیا۔ مگر نیند آنکھوں سے بہت دور کہیں چلی گئی تھی۔ اور جو بُرجی کی پہاڑی
سے اتر کر نیچے کی وادی سے گزر کر دوسری پہاڑی کی سنگلاخ چٹانوں پر سفر کر رہی تھی
اور پھر پتھروں کے تیکھے اور چٹیان کے عقب میں اور غار کے دروازے پہ ایک ہستی کو
ڈھونڈ رہی تھی یہ ایک سایہ تھا کہ چھلاوا تھا۔ کہ سچ مچ خوبصورتی کا مجسمہ تھا جو پرستش
کیے جانے کے قابل تھا۔ مگر اس پرستش کا فائدہ بھی کیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے
ڈاکوؤں کو اسے لیجاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔ کیا وہ واقعی کچھ
نہ کر سکتا تھا۔ کیا وہ اس کے لئے گولی کھا کر مر نہ سکتا تھا۔ وہ چلاتی رہی۔ مدد کے
لئے پکارتی رہی اور کوئی ہاتھ اور کوئی قدم اور کوئی جسم اور کوئی دل آگے
نہ بڑھا۔

چاہت! محبت! یہ الفاظ تھے کہ ریت کے ذرّے تھے، اُسے چاہت
نہ بھی ہو پھر بھی اُسے بچانا ایک انسانی فرض تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک راجکماری
تھی، اس لئے کہ اُس نے اُس پر بھروسا کیا تھا۔ کیا اُس کی آخری نگاہوں کی
فریاد میں اُس کے اعتبار کی شکست تھی۔

نریندر نے نگاہ اٹھا کر نیم کے پیڑ کی طرف دیکھا۔ جس کی ایک شاخ اُس نے

اپنے ہاتھ سے کاٹ ڈالی تھی اور پھر بے قرار ہو کر ایک کروٹ لی کروٹ لیتے وقت یکایک کوئی چیز اُس کی کمر میں زور سے چبھی۔ نریندر نے اُسے جیب سے نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھا۔ یہ رات کی سیاہی میں نور کا لرزتا ہوا کنگن تھا۔ اُسے اپنے آپ پر خندہ زن معلوم ہوا۔ نریندر نے نگاہیں اُٹھا کر بڑی بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ جگہ جگہ الاؤ بجھ چکے تھے۔ تاریکی گہری ہو گئی تھی غلام رسول بے سُدھ سویا پڑا تھا۔ ریل گاڑی کے آس پاس اور دُھندلکے دُھندلے ٹیلوں کے دھبّوں میں تاریک صورتیں پہرہ دیتے ہوئے سایوں کی طرح حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

یکایک نریندر اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ اُس نے بڑی احتیاط سے چاروں طرف دیکھا پھر سانس روک کے اور گھٹنوں کے بل ریت پر چلتے ہوئے گھسٹتے ہوئے کوئی آہٹ کیے بغیر بم کے پیڑ سے پرے جانے لگا۔

اُنیسواں باب

وہ چوبرجی کا راستہ چھوڑ کر مشرق کی طرف گھوم کر پہاڑی پر چڑھنے لگا چونکہ چوبرجی پر بھی ان لوگوں نے اپنے پہرے دار مقرر کر رکھے تھے اس لئے اُس نے وہ راستہ اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا وہ لوگ پہلے ہی سے اُسے شک شبہے کی نظروں سے دیکھتے تھے جانے کیسے یہ بات گاڑی کے مسافروں میں پھیل گئی تھی کہ وہ ڈاکوؤں سے ملا ہوا تھا۔ وہ تو خیریت گزری کہ جمال الدین ملاج دین اور بہاری اور چند دوسرے لوگوں کو اس کا یقین نہیں آیا ورنہ وہ لوگ اُسے جانے ہی نہیں دیں گے بلکہ اگر کسی نے اُسے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تو سارا شبہ اور قوی بلکہ یقین کی حد تک پہنچ جائیگا کہ وہ واقعی ڈاکوؤں سے ملا ہوا ہے اُس حالت میں اُس کا ان لوگوں کے ہاتھوں زندہ بچ نکلنا واقعی محال ہو گا۔ اس لئے اُس نے اپنا جانا پہچانا راستہ چھوڑ دیا اور چوبرجی سے ہٹ کر بہت دور مشرق کی طرف سے آہستہ آہستہ دبے پاؤں پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ یہ راستہ

اُس کے لیے بالکل نیا تھا۔ رستہ تو تھا ہی نہیں یونہی اُس نے اندازے سے ایک سمت مقرر کر لی تھی۔ کہ اگر وہ یوں سیدھا ادھر سے اوپر چڑھتا جائیگا۔ تو پہاڑی کی چوٹی تک پہنچ جائیگا خیریت گزری کہ اُس وقت اندھیرا بہت تھا اور یہ اندھیرا اُس کی مدد کر رہا تھا بھاگنے میں مدد کر رہا تھا۔ مگر راستہ ڈھونڈنے میں مشکل بھی پیدا کر رہا تھا۔ دو ایک بار تو اُس کا سر آگے بڑھی ہوئی نوکیلی چٹانوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ کئی بار اُسے ایک بڑی جھاڑی کے پیچھے ایک آدمی کا سایہ سرکتا ہوا نظر آیا اور وہ وہیں خوف سے ایک چٹان کے پیچھے دُبک کر بیٹھ گیا۔ اُن لوگوں نے شاید اُسے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کا تعاقب کر رہے تھے اس خیال کے آتے ہی اُس کے چہرے سے پسینہ پھوٹ نکلا اور اُس کا دل بہت زور زور سے دھک دھک کرنے لگا تھا ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کے دل کی دھڑکن ڈھول کی دھمک کی طرح جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے آدمی تک پہنچ رہی ہے وہ بہت دیر تک اس چٹان کے پیچھے دُبکا رہا۔ وقت گزرتا گیا۔ مگر وہ آدمی اُس بڑی جھاڑی سے باہر نہیں سرکا۔ منیندر نے سوچا ممکن ہے یہ سب واہمہ ہو وہاں جھاڑی کے پیچھے کوئی نہ ہو ممکن ہے کوئی ہو۔ اگر ایک آدمی ہوگا تو اس سے وہ نپٹ لیگا اس کا جی چاہا کہ وہ چٹان کے پیچھے سے یکایک اُٹھ کھڑا ہو اور ایک جست لگا کر جھاڑی کے پیچھے چھپے ہوئے آدمی کی گردن سے دبوچ لے لیکن اگر دو آدمی ہوئے تو؟ معلوم تو کرنا چاہیے کہ دشمن تعداد میں کتنے ہیں، اس نے یہ سوچ کر ہولے ہولے چٹان کے پیچھے سے سرکتے ہوئے ٹیلوں کے میں کھسکتے ہوئے ریت پہ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے کوئی آواز پیدا کیے بغیر اُدھر کا رخ کیا جہاں اُس جھاڑی کا عقبی حصہ اُس کے سامنے ہوگا اور اس کے دشمن کی پیٹھ اُس کی طرف ہوگی ور پیچھے سے بے خبری میں وار کر سکے گا۔ اس صورت میں اگر وہ بھی جھپٹے تو مضائقہ نہیں وہ سانس روکے

آہستہ آہستہ رینگتا گیا بیچ بیچ میں رُک رُک کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا۔ دھیرے دھیرے ریت پر سانس چھوڑتا ہوا پھر آگے بڑھنے لگتا۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وہ اُس مقام پر آیا جہاں سے وہ اپنے دُبکے ہوئے دشمن کو پیچھے سے دیکھ سکتا تھا مگر یہاں بھی ایک چٹان تھی جس نے اُس جھاڑی کے عقبی حصے کو اُس کی نظروں سے پوشیدہ کر لیا تھا دھیرے دھیرے نربندا نے اُس چٹان کے گرد بھی ایک چکر کاٹا اور بڑی مشکل سے کوئی آہٹ کیے بغیر اس مقام پر پہنچ گیا جہاں وہ گردن نکال کر جھاڑی کے عقبی حصے کو دیکھ سکتا تھا یہاں پہنچ کر اُس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ اپنے سانس کی دھونکنی کو ٹھیک کیا اور پھر بہت احتیاط سے اُس نے چٹان کے پیچھے سے اپنا سر نکالا اور سر نکالتے ہی اُس کی نگاہیں چار چمکتی ہوئی سُرخ آنکھوں پر پڑیں اُن آنکھوں کے اوپر لمبے لمبے سایہ نما کان کھڑے پھر تیزی سے جنبش کرتے ہوئے وہ دونوں خرگوش بھاگ گئے۔ نربندا کچھ شرمندہ سا ہوا کچھ ناامید سا ہوا۔ کچھ اپنی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط پر نادم ہوا اُس کے جسم کا شدید تناؤ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے اعصاب جو اب تک گویا برقی رو سے کھنچے جا رہے تھے یکایک سرد پڑ گئے اور وہ اپنی بے وقوفی پر ہنسا۔ وہ ہر چٹان کے پیچھے اب تک ایک دشمن کو چھپا ہوا سمجھ رہا تھا اب اِن خرگوشوں کو دیکھ لینے سے اُس پر یہ ردِ عمل ہوا کہ وہ ذرا بے فکر ہو کر خاصی تیزی سے پہاڑی پر چڑھنے لگا اور کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں اُس مقام پر پہنچ گیا جس کی سیدھ میں اُسے وہ جھونپڑی صاف نظر آتی تھی سامنے نالے کے نشیب میں اُسے بڈھے کسان کے گھر کا حصہ نظر آ رہا تھا اُس سے پرے زیادہ تاریک حصہ اس جزیرے کا تھا جس کے اندر کنواں تھا اور کنوے کے پرے ڈاکوؤں کی پناہ گاہ تھی جس کی کھوہ کے اندر اس کی بلو تھی۔

نریندر نے گردن اٹھا کے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ وہ سوکھی ندی کے بیچ میں کھڑا تھا۔ اور اُس کے دونوں طرف سیاہ پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک کے اوپر چوبرجی تھی۔ دوسری کی نوکیلی چوٹی کے اوپر کچھ نہ تھا۔ اس وقت رات کی تاریکی نے ان غاروں کو بھی چھپا لیا تھا جو دن میں اس پہاڑی کے عین وسط میں دکھائی دیتے تھے۔ نریندر نے چند لمحوں کے لئے چوبرجی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اسے خیال بھی آیا کہ وہ ٹوٹ جائے۔ اور اس حماقت میں نہ پڑے۔ دوسرے لمحے میں وہ پھر آگے چل پڑا کنویں سے گھوم کر جب وہ اس مقام پر پہنچا جہاں سے پہاڑی کی چڑھائی شروع ہوتی تھی تو چاند نکل آیا اور زمین و آسمان، جھاڑیاں اور درخت، چٹانیں اور پتھر اس کے مدھم مدھم نور میں ڈوب گئے۔ پہلے تو نریندر کی آنکھیں جو اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں زور سے جھپک گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ دھبے سمٹ گئے۔ چیزوں کی شکل نکل آئی۔ یہ درخت ہے، یہ جھاڑی ہے، یہ پتھر ہے، یہ چٹان ہے، یہ اس کا سایہ ہے چیزوں اور فاصلے گہرائیاں اور گولائیاں، مکعب اور جسامت، یعنی ہر وہ چیز جو آنکھ کے احساس کیساتھ جاتی ہے۔ اُسے اپنی صحیح حالت میں نظر آنے لگی۔ اسوقت وہ چوبرجی سے بہت دور تھا۔ اور اب پیچھے کے دشمن کا اسے ڈر نہ تھا۔ اب اسکے دل میں سامنے کا دشمن کھٹکنے لگا۔ یہ بھی اچھا ہوا نریندر نے سوچا، چاند نکل آیا۔ اپنے ذہن میں اس نے اب تک راجکماری تک پہنچنے کی جو ترکیب سوچی تھی اسے اس نے مسترد کر دیا۔ اب ایک بالکل نئی ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ اور اس ترکیب کا خیال چاند کی آمد کے متعلق تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں اسوقت چاند کو بروقت اجالنے پر مبارکباد دی اور وہ گھنگناتا ہوا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا، لاپرواہی سے بازو ہلاتا ہوا ڈاکوؤں کی پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

بیسواں باب

رستے میں کسی نے نریندر کو نہیں روکا۔ کسی نے اس سے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کسی قسم کی باز پرس نہیں ہوئی۔ اگر رستے میں ڈاکو اور اس کے حمایتی کہیں چھپے بیٹھے گھات سے دیکھ بھی رہے تھے تو اسے کم از کم اس کا پتہ نہ تھا۔ پروا بھی نہ تھی۔ وہ آج ہر قسم ڈر اور خوف سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھ رہا تھا آج اس نے اپنے دل سے اپنی جان کا جسم اور اپنی روح کا سارا ڈر نکال دیا تھا۔ آج وہ اپنے آپ کو بالکل ہوا کے جھونکے ہلکا پھلکا اور پاک صاف محسوس کر رہا تھا۔ ایک دو جگہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چیتا پیچھے سے سائے سے سرک گئے اور ایک جگہ گھاٹی پر چھوٹے چھوٹے پتھر اپنی جگہ سے اور نیچے کھڈ میں لڑھک گئے لیکن اس نے ذرہ بھر پرواہ نہ کی اور بے خوفی آگے بڑھتا گیا۔ غاروں کے قریب پہنچ کر رستہ تنگ ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے سفر کرنے والا، گھاٹی پر چڑھنے وا

دو تین راستے اختیار کر سکتا تھا۔ مگر غاروں کے قریب پہنچکر یہ سب پگڈنڈیاں ایک ہی رستے میں مل گئی تھیں۔ یہاں چٹانیں رستے کے دونوں طرف بہت اونچی تھیں۔ نریندر نے گردن اونچی کر کے دونوں طرف دیکھا۔ ان چٹانوں کی چوٹیوں پر مشین گنوں کے دنگھونسلے آراستہ رکھے ہوئے ایک پوری فوج کا بڑی آسانی سے صفایا کر سکتے تھے اور وہ تو بالکل ننہتا تھا۔ آگے بڑھ کر راستہ اس قدر دشوار گزار تھا کہ صرف ایک آدمی ایک وقت میں ان چٹانوں پر چڑھ سکتا تھا۔ یہاں سفید چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر ایک تنگ سا زینہ بنایا ہوا تھا جو کوئی سو فٹ اوپر چلا جاتا تھا۔ نریندر سیٹی بجاتا ہوا آہستہ آہستہ اس بلند زینے پر چڑھنے لگا جو چٹان کے سینہ پر کھدا ہوا تھا۔ اس چٹان کے بالکل اوپر غار تھے۔ اب وہ اپنی منزل کے بہت قریب آگیا تھا۔ چٹان پر چڑھتے چڑھتے اسکا دم پھول گیا۔ کیونکہ یہ آخری چڑھائی بہت سخت تھی۔ چڑھائی چڑھ کر وہ ایک چٹان سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں قدرتی طور پر دو چٹانیں اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہو گئی تھیں کہ انکے پیچھے کے نار نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ مگر نریندر نے نیچے سے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ ان چٹانوں کے پیچھے ان غاروں کا سلسلہ ہے جن میں سے کسی ایک غار میں راجکماری قید ہے مگر کس غار میں؟ نریندر کو ایک سگریٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ ایک مڑا ہوا مچلجا سا سگریٹ بالآخر اسے اپنی کسی ایک جیب کے کونے میں مل ہی گیا اس نے مڑے ہوئے سگریٹ کو سیدھا کیا۔ تمباکو جو جگہ جگہ سے سرک کر کونوں میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ اسے سگریٹ کی کاغذی نلکی میں ہموار کیا۔ پھر اس نے آہستہ سے سگریٹ کا کونہ اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ اور اب ماچس ڈھونڈھنے کیلئے اس نے پھر جیب ٹٹولنی شروع کی اتنے میں کسی نے ماچس جلا کر اس کے سگریٹ سے لگا دی۔ نریندر ایک لمحے کیلئے ٹھٹکا ایک

لمحے کے لئے خوف کا سرد اور برفیلا ئیل اس کے سارے جسم میں سرایت کر گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اپنے جسم کو بالکل برف کے تودے کی طرح محسوس کیا جس میں کہیں بھی گرمی اور حرارت نہ ہو۔ مگر صرف ایک لمحے کے لئے دوسرے لمحے میں اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور گردن جھکا کر دو مضبوط ہاتھوں میں بھرے ہوئے ماچس کے شعلے سے اپنے سگریٹ کو سلگا لیا۔ پھر ماچس بجھ گئی۔ پھر کسی نے کہا، بھاری گمبھیر آواز میں۔

"کب آئے؟"

نریندر نے جواب دینے سے پہلے سگریٹ کے دھوئیں کو بہت زور سے اندر کھینچ لیا۔ جیسے وہ بالکل بے اختیار ہو کر سگریٹ کے گرم گرم دھوئیں کو اپنی روح کی پنہائی پھیلا دینا چاہتا ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے گھوم کر سگریٹ کے دھوئیں کو منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔

"ابھی آیا ہوں۔"

نریندر نے سر سے پاؤں تک ماچس جلانے والے پر نظر ڈالی۔ یہ جیت سنگھ تھا جیت سنگھ ڈاکو جس کے قبضے میں راجکماری تھی جیت سنگھ نے بھی سر سے پاؤں تک نریندر کو دیکھا۔ خاموشی کا ایک لمبا وقفہ سگریٹ کے ایک کش کی طرح گزر گیا جیت سنگھ نے پوچھا۔

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"راجکماری سے ملنے کا ارادہ ہے۔"

"اس سے مل کر کیا کرو گے؟"

"اسے اپنے ساتھ واپس لے جاؤں گا۔"

جیت سنگھ کا گٹھا ہوا مضبوط بدن یکایک فولاد کی طرح تن گیا اپنے سارے جسم میں ایک سنسناہٹ سی محسوس کی۔ ذرا تیز آواز میں بولا " کیسے ؟"

نریندر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا " اپنا بازوؤں پر اٹھا کر"

" یہ پستول دیکھتے ہو" جیت سنگھ نے پستول کی نالی اس کے سینے پر رکھ کر کہا۔

" ہاں !" نریندر ذرا بھی نہیں جھجکا۔ اسے معلوم تھا۔ اگر وہ ذرا بھی جھجکا۔ کہیں بھی لچک گیا۔ تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

" یہ پستول کی گولی ابھی تمہارا سینہ چیر کے تمہاری زندگی تمہاری خواہش اور تمہارے سارے سپنے ختم کر سکتی ہے"

نریندر نے کہا "میں پستول کی گولی کے کرتب سے واقف ہوں مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم راجپوت ہو۔ ایک نہتے پر گولی نہیں چلاؤ گے"

جیت سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا "میرے آدمیوں نے بہت دور نیچے سے تمہیں آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو تمہیں رستے ہی میں ختم کر سکتے تھے۔ مگر میں نے منع کر دیا۔"

"کیوں ؟"

جیت سنگھ نے کہا۔ میں نے سمجھا تم ہمارے گروہ میں شامل ہونے کیلئے آ رہے ہو۔"

نریندر نے پوچھا۔ اگر میں تمہارے گروہ میں شامل ہو جاؤں تو کیا راجکماری اور سحر بالا کو چھوڑ دو گے ؟"

" کبھی نہیں۔ راج کماری کو کبھی نہیں۔ ہاں سحر بالا کو تم ابھی واپس جا سکتے ہو۔"

جیت سنگھ حقارت آمیز لہجے میں ہنسا۔
نریندر نے افسردگی سے سر ہلایا۔ بولا "میں کبھی کسی شرط پر اور کسی قیمت پر تمہارے گروہ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"
"کیوں؟" جیت سنگھ نے طنزاً کہا۔ "چوری سے اگلا قدم تو ڈاکہ ہی ہے۔"
"ہوگا! مگر مجھے اب ان دونوں باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں یہ دونوں غیر سماجی اور غیر مفید کام ہیں۔"
"اوہ نو!" جیت سنگھ ہنس کر بولا۔ "میں نے سمجھا تھا میں ایک بہادر آدمی سے بات کر رہا ہوں تم تو پنڈت نکلے۔ پنڈت جی مہاراج ایسا اب بہت اپدیش ہو چکا اب ٹھنڈے ٹھنڈے جدھر سے آئے تھے اُدھر سدھار جایئے۔ میرے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ برہم ہتیا ہو جائے۔" جیت سنگھ نے اسی ہاتھ کی طرف اشارہ کیا جس میں وہ پستول تھامے ہوئے تھا۔
نریندر نے ہنس کر کہا۔
"اب میں راجکماری کو لے ہی جاؤں گا۔"
جیت سنگھ نے کہا تو کیا سنئیہ گرہ کرنے کا خیال ہے دلچسپ ارادہ ہے۔ میں خود اخباروں میں خبر بھجوا دونگا۔
ایک چور کا
ڈاکوؤں کے غار پر ستیہ گرہ
یہ مہرجی کیسے رہے گی؟" جیت سنگھ نے پوچھا۔
نریندر خاموش رہا جیت سنگھ نے کہا "میں ذرا اسی قسم کی باتد

کم یقین رکھتا ہوں۔ گولی سے ابھی تمہارا جسم چھلنی کر کے کھنڈ میں پھینک دوں گا۔ اگر زندہ رہنے کی خواہش ہے تو ابھی لوٹ جاؤ ممکن ہے بعد میں میں یہ ارادہ بھی بدل دوں۔ ویسے اس پہاڑ سے باہر کا کوئی آدمی زندہ واپس نہیں گیا ہے۔ نہ جانے تم پر کیوں رحم آ رہا ہے۔

"اور تو آج راجکماری کو میرے حوالے نہیں کر دو گے؟" نریندر نے پھر پوچھا
جیت سنگھ نے دائیں بائیں سے زور کا ایک گھونسا اس کے منہ پر دیا۔
"ارے تم راجکماری کے سالے ہوتے۔ جب دیکھو راجکماری۔"
نریندر کے منہ سے لہو بہہ رہا۔ اس نے لہو پونچھے بغیر استقامت سے کہا۔
"میں اسے چاہتا ہوں اسے واپس لے جاؤں گا۔"
جیت سنگھ قہقہہ مار کر ہنسا "آہا! حضرت عشق فرمانے ہیں ایک چور کا عشق ایک راجکماری سے بھی یہ تو حد ہے حساب دلچسپ بات سنائی تم نے۔"
جیت سنگھ زور زور سے ہنسنے لگا۔
نریندر نے پوچھا۔
"کیوں؟ اس میں کون سی ہنسنے کی بات ہے؟ اگر ایک ڈاکو ایک راجکماری بیاہ سکتا ہے۔ تو ایک چور کیوں نہیں بیاہ سکتا؟"
"ہاہاہاہا!" جیت سنگھ ہنس کر بولا "ارے چور فی الحال میں تو عارضی طور پر ڈاکو ہوں۔ در اصل تو میں راجکماری کے باپ کا جاگیردار ہوں۔"
"تو عارضی کیوں۔ یوں کہو کہ تم مستقل ڈاکو ہو۔"

جیت سنگھ نے ایک اور گھونسہ اس کے منہ پر دیا۔

نریندر نے کہا۔

"میں بھی لڑنے کیلئے ہی یہاں آیا تھا۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ایک ہاتھ میں پستول لے کر دوسرے ہاتھ سے میرے گھونسہ مارو گے میں سمجھتا تھا تم ایک بہادر انسان کی طرح مجھ سے نہتے لڑو گے۔ جیسے میں نہتا ہوں اور ہم میں سے جو جیت جائے گا۔ وہ راجکماری کو لے جائے گا۔"

جیت سنگھ نے نریندر کو سر سے پاؤں تک ایک نئی نظر سے دیکھا۔ اس کے بدن کے اندر کی مخفی قوت کا اندازہ لگایا۔ اور پھر زور سے قہقہہ مار کے ہنس پڑا اسکا کھلا پاٹ دار قہقہہ ساری فضا میں گونج گیا۔

جیت سنگھ نے پستول ہٹا کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور نریندر کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا۔

"مجھے منظور ہے۔ مگر ایک شرط ہے۔ لڑائی راجکماری کے سامنے ہوگی۔ تاکہ جب میں تمہاری دو ٹانگیں چیر کر تمہیں کھڈ میں پھینکوں۔ تو وہ تمہیں اپنے عاشق کو اپنی آنکھوں سے ہزاروں فٹ نیچے کھڈ میں گرتا ہوا دیکھ سکے۔"

"فرض کرو کہ ایسا ہو گیا۔ پھر تم راجکماری کے ساتھ کیسا سلوک کرو گے"

"یہی جو ہر مرد ہر مفتوحہ عورت کیساتھ سلوک کرتا ہے۔" جیت سنگھ نے ایک وحشیانہ مسرت سے کہا۔

پھر بولا۔ مگر ہم یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہیں۔ یہاں تو لڑنے کیلئے کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔ اس کے لئے ہمیں پہاڑ کی چوٹی پر جانا ہو

جیت سنگھ نے تالی بجائی۔ دوسرے لمحے میں ایک چھ فٹ سے اوپر نکلتے ہوئے قد کا آدمی بالکل اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ جیت سنگھ نے کہا۔ "کرنیل سنگھ تم راجکماری اور سجر کو لے کر پہاڑی کی چوٹی پر آجاؤ۔ . . کوئی آٹھ جوان اور اپنے ساتھ لے آنا ——— !"

کرنیل سنگھ نے مشتبہ نگاہوں سے نریندر کی طرف دیکھا۔

نہیں نہیں ان کی ضرورت نہیں پڑے گی" جیت سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر اک ذرا لطف رہے گا۔"

"بات کیا ہے ؟"

جیت سنگھ نے ذرا تنگ ہو کر کہا "اس وقت تم جاؤ اور راج کماری کو لے کر آؤ۔ بات بعد میں بتاؤں گا۔"

کرنیل سنگھ نے چلتے چلتے پوچھا "اور اگر راجکماری آنے سے انکار کر دے تو ؟"

"تو اسے پیٹھ پر اٹھا لانا۔ اور سجریا کا کیا ہو گا ؟ جیت سنگھ نے ایک آبرو کھینچ کے کرنیل سنگھ کی طرف دیکھا

کرنیل سنگھ خفیف سا مسکرا دیا۔ اور چلا گیا۔

جیت سنگھ نے پستول پھر جیب سے نکال لیا اور نریندر کو آگے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا "معاف کرنا۔ یہ پستول صرف تمہاری حفاظت کے لئے ہے۔ تم آگے آگے چلو۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے چلتا ہوں۔ وہ سامنے پہاڑ کی چوٹی ہے۔ پھر بھی وہاں تک پہنچتے پہنچتے رات کا تیسرا پہر تو ہو جائیگا۔

نریندر آگے آگے چلنے لگا۔

جیت سنگھ اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا کبھی کبھی وہ پیچھے مڑکر دیکھ لیتا۔ کرنیل سنگھ ابھی تک راجکماری اور سجریا کو لے کر آیا نہ تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے اسی طرح خاموشی سے چلنے کے بعد جیت سنگھ کو کرنیل سنگھ کے ساتھ دو عورتیں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ وہ اس کے بہت پیچھے ہوتے ہوتے چل رہی تھیں۔ ان کے پیچھے سات آٹھ ڈاکو اور بھی تھے۔ جیت سنگھ جواب تک خاموش تھا، اب مسکرا کے بولا۔

"وہ آگئی تمہاری موت!"

نریندر نے پیچھے مڑکے دیکھا۔ دور بہت نیچے اسے راجکماری کا چہرہ نظر آیا۔ اس ایک نظر کے بعد نریندر نے پھر پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔ سارے راستے وہ خاموشی سے چلتا رہا۔ جیت سنگھ نے کہا "مجھے تمہاری جوانی پر رحم آتا ہے۔" نریندر خاموشی سے چلتا رہا۔ جیت سنگھ نے کہا "تم جوان ہو ابھی ساری زندگی تمہارے سامنے پڑی ہے تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ کالج کے لونڈے معلوم ہوتے ہو۔ اس خوبصورت سی پیاری جان کو کیوں ایک عورت کیلئے ضائع کر رہے ہو۔" نریندر خاموش رہا۔ جیت سنگھ نے کہا اگر مجھے اس بات کا سو فیصدی یقین نہ ہوتا کہ میں تمہیں دو منٹ میں ہی کچل دوں گا تو میں تو کبھی کسی عورت کیلئے نہ لڑتا۔ آدمی لڑے تو کسی بات کے لئے لڑے۔ اپنی زمین کیلئے لڑے۔ اپنی جاگیر کے لئے لڑے۔ اپنی آن اور عزت کیلئے لڑے عورت تو سراسر فریب ہے، سراسر بے عزتی ہے۔ سراسر دھوکا ہے۔ سراسر بے وفائی ہے۔ عورت کے لئے لڑنے سے تو یہی بہتر ہے کہ آدمی اپنے کتے سے لڑے کتے میں پھر بھی کوئی بات ہوتی ہے۔ نریندر خاموش رہا۔ جیت سنگھ نے کہا "جب

میں جاگیردار تھا۔ میں نے اپنے علاقے میں کسی خوبصورت عورت کو نہیں بخشا۔ اور ان میں سے ننانوے فیصدی تو خوشی خوشی میرے پاس آجاتی تھیں۔ بس اسی سے سمجھ لو۔ کہ کیا چیز ہوتی ہے۔ عورت؟ نقش!" جیت سنگھ نے زور سے ایک چٹان پر تھوک دیا۔

جب جیت سنگھ اور نریندر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو اس وقت چاندنی خوب اچھی طرح کھل کر چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ یہاں سے دور دور کا منظر بہت صاف نظر آ رہا تھا۔ چاندنی میں نتھرا نتھرا نظر آتا تھا۔ سنگ مرمر کی ڈھلانیں نالے تک پھیلتی ہوئی نالے میں درختوں کا جزیرہ۔ نالے کے پار کی پہاڑیاں۔ اور ایک پہاڑ پر وہ سنگ سرخ کی راجپوتی چوبرجی۔ جہاں بیٹھ کر نریندر نے راجکماری کے پاؤں سے کانٹا نکالا تھا۔ اس وقت اسے کیا معلوم تھا۔ کہ یہ کانٹا اتنا گہرا اس کے دل میں کھب جائیگا کہ ہزار بار نکالنے پر بھی نہ نکل سکے گا۔ یہ کاہش، یہ خلش، یہ اس درد کی میٹھی سی اذیت کیا ہے۔ وہ اس اذیت کو کیوں اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ کیوں بار بار اسی کانٹے کو اپنے دل میں چبھوتا ہے۔ محبت اپنی تمناؤں کے خون کے سوا کیا ہے۔ پھر بھی وہ کیوں محبت کئے جا رہا ہے۔

اس محبت کے خلاف اس نے آخری لمحے تک جدوجہد کی تھی۔ اسے اپنے اپنے دل سے نکال پھینکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ ہر بہانے سے اپنی روح کو بہلایا تھا کہ یوں نہیں ہے۔ یوں نہیں ہے۔ مگر آخر وہ یوں ہو کے رہا۔ اور یوں ہو کے رہا

کہ وہ کھینچ کر اس پہاڑ کی چوٹی پر آ گیا۔ ایک ڈاکو سے مقابلہ کرنے کیلئے۔ کیسی حماقت تھی یہ۔

مگر جب اس نے راجکماری کو چوٹی پر آتے ہوئے دیکھا تو اسنے سوچا، اگر یہ حماقت ہے۔ تو پھر وانٹے اور شکسپیر نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب حماقت ہے۔ پھر تو ہیرس بھی حماقت ہے اور جیولیٹ حماقت ہے۔ اور سیتا بھی حماقت ہے۔ اور خود زندگی حماقت ہے

جب سب لوگ چوٹی پر آ گئے تو جیت سنگھ نے کہا "میرے اور اس نوجوان کے درمیان فیصلہ یہ ہوا ہے کہ ہم دونوں نہتے لڑیں گے اور ہم میں سے جو جیت جائے گا یعنی زندہ رہ جائے گا۔ وہ راجکماری لے جائے گا۔ اگر میں زندہ رہ گیا تو میں خود فیصلہ کروں گا کہ مجھے راجکماری کیساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر یہ نوجوان جیت گیا۔ تو میں تم سنتے گنگا مائی کی قسم لیتا ہوں کہ تم میری موت کا بدلہ اس نوجوان سے نہ لو گے۔ بلکہ اسے راجکماری اور سجریا کو اپنے ساتھ لیجانے دو گے"

ڈاکو خاموشی سے کھڑے تکتے رہے راجکماری مڑ مڑ کر نریندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیت سنگھ نے گرج کر کہا۔

"گنگا مائی کی قسم کھاؤ"

سب ڈاکوؤں نے ہاتھ جوڑ کر گنگا مائی کی قسم کھائی۔

جیت سنگھ نے للکار کے کہا "نریندر! میدان میں آجاؤ"

نریندر نے لڑنے سے پہلے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سفید سفید چٹانوں سے گھری ہوئی چوٹی سنگ مرمر کا پیالہ معلوم ہوتی تھی۔ تین طرف چٹانیں تھیں۔ لیکن چوتھی

طرف یہ چوٹی ڈھلان میں تبدیل ہوتے ہوتے ختم ہوگئی تھی۔ اسطرف پانچ ہزار فٹ گہری کھڈ تھی۔ نریندر نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ دور نیچے ایک خشک نالہ تھا۔ نالے کے بیچ میں ایک چٹان کٹ کر گر پڑی تھی۔ اس پر ایک درخت گرا ہوا پڑا تھا۔ سامنے کبھی آبشار ہوگا: اب تو صرف چاندنی آبشار کی طرح چٹانوں پر گر رہی تھی۔ پھر اس نے راجکماری کی طرف دیکھا۔

جیت سنگھ نے اسے ایک گھونسہ رسید کیا۔ "ادھر کیا دیکھتے ہو۔ ادھر دیکھو" اور وہ دونوں گتھ گئے جیسے وہ کرتی دو جسم نہ ہوں۔ ایک جسم ہوں چار ہاتھوں اور چار ٹانگوں پر ادھر اور کبھی اُدھر لڑھکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دونوں حملہ کرنے کیلئے تیار رستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ جیت سنگھ زیادہ مشاق اور تکڑا تھا۔ مگر نریندر زیادہ جوان تھا۔ اور لچکیلا تھا جیت سنگھ کا مکہ ایک گرز کیطرح پڑتا تھا۔ نریندر کی بانہہ ایک فولادی شاخ کی طرح لچکتی تھی۔ کشتی کے داؤ پیچ سے دونوں واقف تھے۔ مگر جیت سنگھ زیادہ سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔

جیت سنگھ نے دھوبی پٹکا لگا کے نریندر کو نیچے گرا لیا۔ لیکن نیچے گرتے گرتے نریندر نے جیت سنگھ کے سینے پر اتنے زور کا مُکا مارا کہ نریندر ادھر اور جیت سنگھ ادھر گر پڑا۔ پھر دونوں ایک ساتھ اٹھے۔ لیکن جیت سنگھ ذرا ایک، یا ایک لمحے کا سواں حصہ پہلے اٹھا۔ لیکن یہ ذرا سی پہل سے فائدہ پہنچا گئی۔ اور اس نے اٹھتے ہی وہ تابڑ توڑ حملے شروع کئے۔ وہ مکّے اور گھونسے لگائے کہ نریندر کے منہ سے لہو جاری ہوگیا۔ اور ایک لمحے کے لئے وہ بالکل چکرا کر وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اور قریب تھا کہ گر پڑے کہ جیت سنگھ نے فتح کی

کی مسرت میں ایک زور کی چیخ مار کر اسے اپنے بائیں ہاتھ میں اوپر اٹھا لیا۔ اور خود چکریاں لے لے کر ڈھلوان کی طرف چلا تاکہ نریندر کے بیکار جسم کو نیچے کھڈ میں پھینک دے۔ راجکماری کے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکلی۔ اور اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ یکایک نریندر کو ہوش آیا۔ اور چشم زدن میں اس نے محسوس کیا کہ اب وہ زمین پر نہیں ہے۔ ہوا میں گویا معلق ہے اور جیت سنگھ میں چکریوں میں گھومتا جا رہا ہے۔ اب چند لمحوں کے بعد اس کا جسم ہزاروں فٹ نیچے کھڈ میں ہوگا۔ وہ یکایک جیت سنگھ کے بازوؤں میں یوں تڑپ کر لچکا کہ اسکے دونوں پاؤں جیت سنگھ کی گردن پر آ گئے۔ اور جیت سنگھ کی گردن کو ایک فولادی گرفت میں لے لیا۔ جوں جوں جیت سنگھ ڈھلوان کے قریب آتا جاتا۔ یہ گرفت مضبوط ہوتی جاتی۔ آخر جیت سنگھ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اسکی سانس اس کے حلق میں رکنے لگی۔ کے ہاتھ نریندر کے گرد ڈھیلے پڑ گئے۔ اور نریندر جیت سنگھ کیا تھ نیچے زمین پر گر پڑا۔ لیکن زمین پر گرتے ہی جیت سنگھ نے اپنی گردن کو نریندر کی ٹانگوں کی پکڑ سے نکال لیا عین اسوقت اس کے ہاتھوں میں زمین پر پڑی ہوئی چٹان کا ایک بڑا سا ٹکڑا آ گیا۔ جسے اس نے کھینچ کے نریندر کے سر پر دے مارا اور اگر عین اسی لمحے نریندر جھکی کھا کر سر کو بچا نہ لیتا تو اس کا سر پاش پاش ہو جاتا۔ لیکن وہ تو خیریت گزری کہ وہ پتھر چالاکی سے اسکے سر میں نہیں لگا۔ لیکن اسکی پنڈلی سے رگڑتا ہوا ضرور گزر گیا۔ پھر دور تک اس پتھر کے کھڈ میں گرنے کی آواز رہی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوئے پتھر کی صدا سنتے رہے۔ یہ صدا جو ان دونوں میں سے کسی ایک کے لئے تھی۔ نریندر غصے سے کہا "تم نے پتھر مار کر لڑائی کے اصول کو توڑ دیا ہے"

"تمہاری اور تمہارے اصول کی ایسی کی تیسی" جیت سنگھ نے دانت پیس کر کہا۔ نریندر کی پنڈلی سے لہو بہہ رہا تھا۔ یہ لہو اب جیت سنگھ کے جسم پہ تھا۔ نریندر کا لہو جیت سنگھ کے جسم پر تھا۔ اور جیت سنگھ کا لہو نریندر کے جسم پہ لہو اور پسینہ اور سانس ایک تھے۔ اور اب وہ دونوں بالکل وحشی جانوروں کی طرح لڑ رہے تھے۔ کتنے ہزاروں برس پیچھے کے جانوروں کی طرح دانت پیستے ہوئے آنکھیں سرخ کئے ہوئے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ نریندر پنڈلی کے زخم کی وجہ سے اپنے دھڑ میں ایک عجیب سی کمزوری محسوس کرنے لگا۔ اتنی عقل اور سوجھ بوجھ اس میں تھی۔ کہ اس وقت اس نے اٹھ کر لڑنے میں اپنی بہتری نہ سمجھی۔ اس نے سوچا جب تک اس کے پاؤں میں پھر سے طاقت نہ آئے اور وہ بالکل اسی طرح زمین پر لیٹے لیٹے جیت سنگھ کے ساتھ الجھا ہوا اس سے لڑتا رہیگا۔ اور اسے اٹھنے ہی نہیں دیگا۔ جیت سنگھ اٹھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ زمین پر رگڑنے سے کہنیاں چھل جاتی ہیں اور بدن کا ستیاناس ہو جاتا ہے مگر نریندر سر الجھاؤ میں ایسے داؤ پر لاتا تھا کہ وہ دونوں زمین پر لیٹے ہی لیٹے اچھلتے چلتے تھے جیت سنگھ وحشی سؤر کی طرح ہونکتے ہوئے نریندر کو پٹخنی دیکر اس کے اوپر چڑھ گیا۔ دوسرے لمحے میں نریندر نے اسے پٹخنی دے دی۔ اب نریندر نے تاک کے ایسے دو چار گھونسے جیت سنگھ کے جبڑے پر لگائے کہ اس کا منہ کھل گیا۔ اور جیت سنگھ کو ایسا غصہ آیا ایسا غصہ آیا کہ وہ وہیں نریندر پر پلٹ پڑا اور محض اپنی زیادہ طاقت کے بل بوتے پر اس نے کروٹ لیکر نریندر کو زیر کر لیا۔ اب جیت سنگھ اوپر تھا۔ نریندر نیچے تھا۔ نریندر نے اپنی بانہوں سے اسے جکڑ رکھا تھا اور جیت سنگھ نے اپنی ٹانگیں اس طرح نریندر کی ٹانگوں میں پھنسا رکھی تھیں کہ اب ان دونوں میں سے کوئی زمین سے نہ اٹھ سکتا تھا۔ اب وہ دونوں اسی طرح ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ڈھلوان کی طرف لیجا رہے تھے۔

نریندر نے رخ بدلنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جیت سنگھ نے اسے ذرا سا موقع بھی نہ دیا۔ اب وہ اسے دھیرے دھیرے گھسیٹ کر ادھر لے جا رہا تھا جدھر کھڈ تھی۔ جدھر اونچی چٹانیں نہ تھیں۔ بلکہ جدھر ڈھلوان تھی جس کے نیچے پانچ ہزار فٹ گہری موت تھی۔ نریندر نے اپنی ٹانگوں کو چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اسے اپنے دھڑ سے نیچے کا حصہ گویا بالکل بے کار سا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنے حواس مجتمع کر کے دھڑ سے نیچے کے حصے کو کچھ دائیں جانے کیلئے کچھ کہتا۔ لیکن اسکا دھڑ اسکا حکم ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ اور وہ دھیرے دھیرے ڈھلوان کیطرف سرکایا جا رہا تھا۔ ایک ایک انچ کر کے اپنی موت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اب وہ ڈھلوان کی آخری چٹان پر لڑ رہے تھے۔ اور اب وہ جیت سنگھ کی آنکھوں میں ایک وحشی خونی کی فتح کی چمک دیکھ رہا تھا۔ نریندر نے اپنے دھڑ سے کچھ کہنا چھوڑ دیا۔ انچ انچ کر کے وہ دونوں چٹان سے نیچے سرکنے لگے۔ اب تک نریندر کی ساری طاقت اسکے بازوؤں میں تھی۔ اس نے جیت سنگھ کو اس سختی سے جکڑ رکھا تھا کہ جیت سنگھ کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ اکیلے نریندر کو کھڈ میں نہیں گرا سکے گا۔ اگر گرے تو دونوں ساتھ ہی کھڈ میں گر کر مریں گے۔ یکایک اب کی پہلی بار اس لڑائی میں اسے نریندر کے بازو ڈھیلے پڑتے معلوم ہوئے۔ درست ہے۔ یہ ڈھیل بہت کم تھی۔ بہت ہی کم۔ مگر پھر بھی وہ اسکے بازوؤں کے تناؤ میں کمی محسوس کر سکتا تھا۔ یہ کمزوری آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ مگر آ رہی تھی دھیرے دھیرے۔ وہ گھسیٹے ہوئے نریندر کو ڈھلوان کے آخری کونے پر چٹان کے آخری سرے پر لا رہا تھا۔ جہاں پہنچکر وہ بازوؤں کے آخری شدید جھٹکے سے اپنے سینے کو نریندر کے بازوؤں سے چھڑا لیگا اور پھر اپنی دونوں ٹانگوں کی دولتی سے نریندر کو نیچے کھڈ میں پھینک دیگا۔ اب وہ وقت آ گیا تھا۔ جیت نے کنکھیوں سے دیکھا۔ آخری چٹان کا سرا اُن سے صرف کوئی چار گز دور رہ گیا۔

چار گز !

پھر تین گز !

پھر دو گز !

پھر صرف دو فٹ

یہ آخری تین گز تین صدیوں کی طرح لمبے تھے۔ نہ صرف لڑنے والوں کے لیے، بلکہ دیکھنے والوں کے لیے بھی۔

لیکن موت سے دو فٹ ادھر نریندر کے دل میں آئین سٹائن کی قدروں کا خیال نہیں آیا۔ اُسکے دل میں للا جگماری کا چہرہ بھی نہیں آیا۔ اس موقعے پر کسی قسم کے فکر اور فلسفے کی گنجائش۔ موت سے دو فٹ ادھر محبت کا خیال بھی معدوم ہو گیا تھا۔ اور زندگی، اخلاق اور سماج کی ساری حدیں اور قدریں ختم ہو گئی تھیں۔ اب جسم تھا جو لڑ رہا تھا۔ اور اپنے آپ کو ہر قیمت زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ مگر نریندر کا دھڑ بیکار ہو چکا تھا۔ اور جیت سنگھ کو محسوس ہوتا تھا کہ نریندر کے بازوؤں کی طاقت بھی جواب دے رہی ہے، نریندر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیت سنگھ نے ایک زور کا نعرہ لگایا "جے درگا مائی" اور اپنے جسم کی پوری طاقت سے اپنے کو نریندر کے بازوؤں سے آزاد کرا لیا۔ عین وقت پر نریندر نے اپنی بند آنکھوں اپنی روح کے اندر جھانکا اب تک وہ گویا سو رہا تھا۔ جیسے اُس نے اب تک دیدہ و دانستہ جسم کو ڈھیل دے رکھی تھی اب اس نے اپنے جسم و جان کی آخری کوشش سے اپنی ٹانگوں کو ناخون۔ اور اُن کی ساری قوت اور توانائی اپنی ٹانگوں میں منتقل کر دی۔ اور عین اُس پر جب اُن دونوں کے بازو ایک دوسرے سے آزاد ہو گئے عین اُس موقعے پر نریندر نے اس زور سے اپنی ٹانگوں سے دولتی جھاڑی کہ جیت سنگھ کا سارا جسم کئی فٹ

اُوپر ہوا میں اُچھل گیا۔

لیکن جب یہ جسم نیچے گرا تو نیچے کوئی چٹان نہ تھی کوئی زمین نہ تھی۔ کچھ نہ تھا۔ بہت دور نیچے ایک گہری کھائی تھی مگر وہ بہت دور تھی پانچ ہزار فٹ نیچے اور جیت سنگھ کا جسم اس کی مرضی سے نہیں، زمین کی کشش ثقل سے نیچے گرتا جا رہا تھا زمین اور چٹانیں اور درخت نہایت تیزی سے نیچے سے اٹھ کر اس کی طرف آ رہے تھے۔ جیت سنگھ کے ہونٹوں سے ایک ایسی دلخراش چیخ نکلی جو کئی فانیوں تک اس پاس کے پہاڑوں میں گونجتی رہی۔

اس کے بعد اس کا جسم کھڑی چٹانوں پر گر کر پاش پاش ہو گیا۔

وہ چیخ ابھی تک پہاڑوں میں گونج رہی تھی۔ (فضا میں ایک زخمی پرندے کی طرح ڈولتی رہی)

اس کے بعد چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

کئی لمحے زیندر اس چٹان پر پڑا ہانپتا رہا۔ موت سے دو فٹ ادھر۔ آنکھیں بند کئے۔ اب اس کی ساری جدوجہد ختم ہو چکی تھی اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے اس کے جسم سے اس کے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لیا ہے کئی لمحے وہ اسی طرح بے سُدھ پڑا رہا۔

پھر آہستہ سے اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

آہستہ سے وہ اپنی ٹانگوں پر زور دے کر اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے راجکماری کی طرف بڑھا۔ اس کے سارے کپڑے پھٹ گئے تھے اس کا سارا جسم لہولہان ہو گیا تھا۔

ڈاکو ایک چٹان سے لگے اس کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ آدمی نہ ہو۔ کوئی مافوق الفطرت دیو ہو۔

راجکماری کے قریب پہنچ کر نریندر نے اپنا ہاتھ بڑھا کے کہا۔

"آؤ بلو!"

راجکماری نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

نریندر نے اپنا دوسرا ہاتھ بجریا کی طرف بڑھا کے کہا۔

"چلو بجریا!"

بجریا پیچھے ہٹ گئی۔ وہ پیچھے ہٹتے ہی کرنل سنگھ کے سینے سے جا لگی۔ اور اس کے چہرے کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

نریندر نے ایک خشک آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ یہیں رہو۔"

اور وہ راجکماری کو لئے چوٹی سے نیچے اتر گیا۔

اکیسواں باب

نالے کے کنوئیں پر جا کر راجکماری نے کنوئیں سے پانی نکالا اور سرتنیار سنگھ کے زخم دھوئے اور اس کے چہرے، ہاتھ پاؤں پر جمے ہوئے خون کی پپڑیوں کو خود اپنے ہاتھ سے صاف کیا اور پھر اپنی ساڑی کے پلو سے اس کا منہ پونچھا اسکے پاؤں پونچھے اور پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی دانست میں اسے سہارا دیتے ہوئے اپنے سامنے کی پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ جہاں وہ راجپوتنی برجی افق پر اس طرح نمایاں نظر آتی تھی گویا کسی مصور نے آسمان کے کینوس پر اپنی پنسل کی تیز نوک سے ابھار دی ہو۔

اس وقت راجپوتنی برجی میں کوئی نہ تھا۔ سب لوگ نیچے ریل کی لائن کے کنارے سو رہے تھے۔ رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا لیکن ابھی پو پھٹی نہ تھی دور تک ریل کی لائن صحرا کے دونوں طرف افق کے اندھے دروازوں میں داخل ہو کے گم ہو گئی تھی چاند بھی

پہاڑ کی اوٹ میں گم ہو رہا تھا۔ اور اس مدھم موہوم ملگجی فضا کے پس منظر سے دور جھونپڑیاں کے
میں راجکماری سنہری برجی کے فرش پر بیٹھ کر دور تک دیکھا۔ پھر کسی خیال سے نہ جانے سر سے
پاؤں تک کانپ اٹھی۔ جیسے اسے سردی محسوس ہو رہی ہو اور وہ بے اختیار ہو کر نریندر
کے قریب ہو گئی۔ جو اسکی طرح جانے افق کی درزوں میں سے روشنی کی کرن لکیروں کو چن رہا
تھا۔ نریندر نے آہستہ سے سر ہلایا جیسے اسے کہیں سے کچھ نہ ملا ہو۔ پھر اچانک مڑتے ہوئے
کہا "کھیگواں کے سے گاڑی کبھی نہ آئے" نریندر خاموش رہا۔ راجکماری نے کہا اور یہ کہتے
ہوئے اس کی انگلی بے اختیار افق کے اس پار پہاڑیوں کے دامن کی طرف گھوم
گئی "نرین! ہم وہاں اپنا گھر بنائیں گے،

"تمہارا اور میرا گھر ملّو!"

"ہاں تمہارا اور میرا گھر۔ صرف تمہارا اور میرا گھر اور کسی کا نہیں۔ اور ہمارے بچوں کا گھر"
"وہاں ہمارے بچوں کا گھر ایک چھوٹا سا پھوس کا جھونپڑا اور آنگن میں جامن کا
پیڑ" نریندر خواب دیکھنے لگا۔

"اور دروازے کے باہر گائے اپنے بچھڑے کو آواز دیتی ہوئی۔ اور مٹکی میں
دودھ کی دھاریں دھائیں دھائیں کر کے گرتی ہوئی" راجکماری بولی۔

"میں کھیتوں میں کام کرنے جاؤں گا اور تم چھاچھ بلو کے مٹکی ہاتھ میں اٹھا کے
میرے پاس کھیتوں میں آؤ گی۔ آؤ گی نا؟"

"نرین!"

"ملّو!"

دونوں ایک دوسرے کی طرف مڑے۔ دونوں کے ہاتھ بے اختیار ایک دوسرے

کے شانوں پر چلے گئے دونوں ایک ہی جذبے سے بے اختیار ہو کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا وہ نظروں کو یا دُور تک ایک دوسرے میں ڈوبتی چلی گئیں اور ان نظروں کے سنگم سے ایک گہرا بھر آیا کیونکہ گھر تو بعد میں انسان کو ملتا ہے پہلے نظریں ملتی ہیں اور دل ملتے ہیں اور روحیں ملتی ہیں پھر پتہ نہیں کتنے موڑوں، دھاروں اور الگ الگ چلتے ہوئے راستوں کے بعد وہ سنگم آتا ہے۔ جب ایک گہرا بھرتا ہے۔ ایک جامن کا پیڑ اگتا ہے۔ ایک بچہ آغوش میں پلتا ہے ایک ہل کھیت میں چلتا ہے ایک مٹکی سر پر ڈولتی ہوئی کمر کو لچکاتی ہوئی۔ درختوں کی جھومتی ہوئی شاخوں کو چومتی ہوئی دُور سے کھیت کی مینڈ پر چلی آتی ہے دیکھو میں تاروں بھری نگری سے آئی ہوں محبت کی مٹکی میں چاندی کی چھاچھ بلو کے لائی ہوں۔

دور افق پر پو پھٹ رہی تھی۔

نرمیندر نے راجکماری کی آنکھوں میں دیکھا پھر اس نے نیچے پھیلی ہوئی زمین دیکھا نظر اٹھا کر پھیلے ہوئے تاروں والے آسمان کو دیکھا پہاڑوں کی اوٹ میں جاتے ہوئے چاند کی طرف دیکھا رات کے کاجل میں دمکتی ہوئی صبح کی آنکھ کو دیکھا پھر اس لمحے کو دیکھا جو اس کی اور بلو کی زندگی میں آیا تھا اور یکایک اس نے سوچا رات ایک کسان ہے، آسمان ایک کھیت ہے چاند ایک ہل ہے اور رات اپنے کھلیتوں میں لاکھوں تارے بوتی ہے اور صبح کو ایک سورج کا ایک قطرہ، ایک لمحہ، ایک سورج!

یکایک ایک عجیب بے پایاں مسرت سے بے قرار ہو کر اس نے راجکماری سینے سے چمٹا لیا اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ اس لمحے بلو

ایسا محسوس کیا۔ جیسے اس نے صبح کے سورج کو چوم لیا ہو۔

"ببلو!"

راجکماری خاموش تھی اب اس کے لب ذرا کھلے پھر انہیں ہونٹوں کے منتظر پھر اس نے راجکماری کو چوم لیا۔

"ببلو!!"

راجکماری پھر خاموش تھی اب اس کی آنکھیں بھی کھلی تھیں ہونٹ بھی کھلے تھے۔ سینہ بھی دھڑک رہا تھا۔ وہ پھر منتظر تھی۔

یکایک دور، کہیں دور سے ریل کی سیٹی ہوئی۔

راجکماری چونک کے اور گھبرا کے اٹھی۔

اور چھن سے وہ لمحہ ٹوٹ گیا۔

دور اس افق سے جسے وہ گویا پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ریل گاڑی آ رہی تھی۔ کو کو کرتی ہوئی۔ دھواں چھوڑتی ہوئی RESHE TRAIN راجکماری اور نریندر دونوں دم بخود اس گاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔

کو کو۔ کو۔ گاڑی چلی آ رہی تھی۔ نیچے ریلوے لائن کے گرد سوتے ہوئے لوگوں میں ہلچل پیدا ہو رہی تھی۔ لوگ جاگ رہے تھے بھاگ رہے تھے رو رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ ڈرتے ہوئے گاڑی کی طرف بھاگ رہے تھے جو ابھی ان سے بہت دور تھی۔

نریندر نے راجکماری سے کچھ نہیں کہا۔ راجکماری نے نریندر سے کچھ نہیں کہا ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بھی نہیں دونوں وہیں اس برجی کے

فرش پر ایک دوسرے کے پاس ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے خاموش بیٹھے رہے کسی کا جی اٹھنے کو نہ چاہتا تھا۔ اور گو وہ ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھ رہے تھے بار بار کہیں افق پر ان کی نظریں ملتی ہوئی ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں کیا ہوا اگر یہ گاڑی آ گئی یہ ریل گاڑی آتی رہیں گی جاتی رہیں ہمیں کسی سے کیا واسطہ!

اتنے میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ پھر کوئی قریب آ کے رکا پھر کسی نے بھاری آواز میں مؤدبانہ انداز میں کہا۔

"یور ہائینس!"

راجکماری چونک گئی اس کا ہاتھ نریندر کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے سامنے مہاراجہ صاحب کا ایک ایڈی کانگ تھا۔ اور اس کے پیچھے ایک اور ایڈی کانگ تھا۔ ان لوگوں نے باوردی رنگ کی جودھپوری برجیس پہن رکھی تھی اور اُن کے اوپر بند گلے کے کاسنی رنگ کے کوٹ جن کے شانوں پر سنہری گوٹ چڑھی تھی۔ بٹن سونے کے تھے جو سورج کی طرح چمک رہے تھے۔

"یور ہائینس" ایک ایڈی کانگ نے پھر سر جھکا کے کورنش بجالاتے ہوئے کہا "سرکار تشریف لا رہے ہیں۔"

ہز ہائی نس ایک سفید بیلو گھوڑے کو دوڑائے ہوئے آ رہے تھے۔ راجکماری نے اپنے باپ کی طرف دیکھا ایک لحظہ۔۔۔ اسکا سارا جسم کانپا پھر وہ خاموش چپ چاپ وہیں کی وہیں ساکت کھڑی رہ گئی جیسے اسکے پاؤں پتھر کے ہو گئے ہوں۔

راجہ صاحب کا گھوڑا چوبرجی کے قریب آ کے رکا ایک باوردی سائیس نے جو پیچھے پیچھے

بھاگتا ہوا چلا آرہا تھا جلدی سے سامنے آئے گھوڑا پکڑا۔ مگر اس سے پہلے راجہ صاحب
گھوڑے سے اتر چکے تھے۔ اور اپنی بیٹی سے بغلگیر ہو چکے تھے۔ راجکماری ان کی
آغوش میں سسکیاں لے رہی تھی۔ راجہ صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے! انہوں نے
جیب سے دو تین بار ایک خوشبودار عنبریں رومال نکال کر اپنی ناک صاف کی۔
رونے کا ناک سے گہرا تعلق ہے۔ دل سے بھی ہے مگر اس کا پتہ ابھی تک نہ چل سکا۔
"میری بیٹی! میری بیٹی!!" راجہ صاحب اپنی بیٹی کی پیٹھ تھپتھپاتے تھے اور اسے تسلی
دیتے تھے۔ "ہائے ہائے میری ناز و ادا کی پالی بیٹا کیسی غلیظ ساری پہنے ہوئے ہے"
پاس ایک ادھیڑ عمر کا ناگ نے سامنے آکر کہا سرکار پالکی حاضر ہے آٹھ کہار وردی میں لال رومال
سر پر جھولتی ہوئی۔ سہرا سہراتے ہوئے ریشمی پردوں والی خوبصورت پالکی اس رنگ برنگی اچھوتی
ساعت میں آگے کی کہاروں نے ساتھ کے پردے الٹ دیئے اور پھر با ادب اپنی اپنی جگہ پر
ہو گئے۔ "بیٹھو بیٹی!" راجہ صاحب نے بڑی شفقت سے اپنی بیٹی سے کہا" راجکماری مڑی وہ
طرف دیکھنے لگی۔ لیکن نریندر نے آنکھیں جھکائے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ راجکماری کا
قدم نریندر کی طرف بڑھا۔ "بیٹھو بیٹی!" راجہ صاحب نے پھر کہا۔ راجکماری کے قدم رک گئے۔ ر
طرف بڑھتا ہوا تھا ہوا میں رک گیا اس نے گھوم کر اپنے باپ کی طرف دیکھا پھر
نریندر کی طرف جو اب تک نظریں جھکائے چپ چاپ جو پڑی کے فرش پہ بیٹھا
زمین دیکھ رہا تھا۔ راجکماری کبھی نریندر کی طرف دیکھتی کبھی اپنے باپ کی طرف
ایک نگاہ نریندر کی طرف تھی ایک نگاہ اپنے باپ کی طرف، ایک قدم اپنے محبوب کی
۔ ایک قدم اپنے باپ کی طرف ایک روح تھی جو ایک ہی وقت میں دو حصوں میں
تھی مگر ایسا کب ہوا ہے یہ تو ناممکن ہے "بیٹھو بیٹی! گاڑی زیادہ انتظار نہیں

کورے گی"۔ راجہ صاحب ذرا انلنگ مزاجی سے بڑے راجکماری کے دونوں قدم ایک
گئے۔ اس کے اوپر اٹھے ہوئے بازو گر پڑے اس نے اپنا سر جھکا لیا اور نریندر
پلیٹ کر کے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آئی اور پالکی میں بیٹھ گئی کہاروں نے
دیئے اور پالکی کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اٹھتی ہوئی پالکی میں نریندر نے ا
بھر کے راجکماری کی طرف دیکھ لیا۔ پاپو تو کدھر جا رہی ہے؟ اوسو تو تیرا گھر نہیں ہے ہا
کھولس کا جھونپڑا نہیں ہے آنگن میں کوئی جامن کا پیڑ نہیں ہے۔ دروازے پر جھڑے
ہوئی کوئی گائے نہیں ہے پاپو پر تو نے ایک دیا تو نے محبت کا گھر برباد کر دیا اور راج محل
لیا۔ پلو آج کے بعد میرا کوئی نفس تیرے ہونٹوں پر نہیں مہک سکے گا۔ اور میرا کو
بچہ تیری کوکھ سے باہر نہیں آئے گا اور تو سات راجکماروں کی ماں ہو کر بھی میرے
لمس کو ترستی ہوئی مر جائے گی پلو! پلو! پلو!!۔۔ پالکی چلی گئی اور نریندر نے
ایک ملوا لفٹ ہے چاند ایک شرابی ہے سورج ایک گناہ ہے ہر شب رات تا
زبان سے لاکھوں جھوٹے وعدے کرتی ہے اور ہر صبح کو ایک گناہ کا نتیجہ نے "پا
نریندر زور سے چلایا اور شدت احساس سے بالکل پاگل سا ہو کر پالکی کے
دوڑ نے لگا راستے میں کسی نے آ کے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اسے زو
اور پھر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔ نریندر نے کبوتر کی سی سرخ
سے غلام رسول کی طرف دیکھا پھر بالکل بے بس اور مجبور ہو کر اس نے اپنے با
ہوئے ہاتھوں ہتھکڑیاں زور زور سے اپنے ماتھے سے ٹکرا دیں غلام رسول
سے بے ہنسی سے روتے ہوئے کہا "کیا کرتے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو؟"

اب سب کچھ ختم ہو گیا۔

وہ رواداری۔ وہ مساوات۔ وہ بھائی چارہ۔ وہ خواب جو ڈاکوؤں کے کی اولاد تھی۔ آج وہ سب کچھ لوٹ گیا تھا۔ گاڑی کیا آئی تھی زندگی کے سب دریچے اور طبقے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

سیٹھ پوتی لال اپنی بیوی کو لئے ائیر کنڈیشنڈ ڈبے میں بیٹھ رہے تھے کہ پہلوان تیسرے کے ڈبے میں گھس رہے تھے حاجی عیسیٰ اب تاجر بن سے کبھی کا نہیں کر رہے تھے۔

اب وہ ان سب سے نظریں بچاتے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں اپنا سامان رکھ رہے تھے۔ زخمی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اب وہ بھی سیکنڈ کلاس ڈبے میں گھس گیا۔ جہاں پہلے سے کامتھ اور ولیائی بیٹھے تھے۔

ائیر کنڈیشنڈ ڈبے میں میک کی بیوی بیٹھ گئی۔ اداس، تن تنہا سب سے تھالگ۔ وہ تو کسی اور ہی دنیا سے آئی تھی۔ اور ان تمام ہنگاموں سے تھلگ رہی تھی۔

یہ کالے لوگ!

"ان مردوں کا تو کچھ نہ جائے گا!" شگفتہ نرملا سے کہنے لگی "لیکن ہمارے خاوند ہمیں ضرور طلاق دے دیں گے۔"

جھگن اور لکھنؤ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسے۔ لکھنؤ نے اپنا سوٹ کیس کھول کے اس میں سے ایک برانڈی کی بوتل نکالی۔

"یہ آج کے موقعے کے لئے رکھی تھی۔"

"ارے واہ! ایک ہاتھ، ایک کمر، ایک جام، ایک گرم تنفس، ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں موسم ہمیشہ سدا بہار رہتا ہے" جھگن ہنس کر کہنے لگا۔

لکھنؤ مسکرایا اس نے ذرا سا اٹھ کر دروازے پر چولدار پردہ ڈال کر۔

ڈبوں کے قریب سے گزرتے ہوئے نریندر اس گلابی رنگ کے شاندار ڈبے کے قریب ٹھٹکا جس کی کھلی کھڑکیوں میں سے آسمانی رنگ کے خوبصورت پردے لٹکے۔ بالکل سامنے سیاہ ساٹن کے دریچے میں راجکماری بیٹھی ہوتی تھی لیکن وہ بابا رہی تھی۔ نریندر صرف اس کا رخ دیکھ سکتا تھا وہ رخ جس پہ خون کی ایک بوند نہ تھی۔ یہ شاید مرمر کے پتھر سے بنا ہوا تھا۔ راجکماری ایک کرسی پر دراز تھی۔ اس نے شفتان کی ایک قیمتی زریں ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس کے سامنے ایک تپائی

یہ کانچ کے باؤل میں رنگین مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

نریندر کی نگاہوں میں یکایک وہ پہلی گاڑی کا الٹا ہوا ایلون آیا جب فرش
ںوں سے پل چل رہا تھا۔ راجکماری کو ڈھونڈنے کے لئے اور اس کا گیلے فرش پر پڑی
مچھلی پر پڑ گیا تھا۔ پھر اسے یاد آیا اس نے کس طرح اسی لمحے میں اس مچھلی کو اٹھا کر پانی
ل میں ڈال دیا تھا۔ یکایک نریندر نے سوچا ٹھیک تو ہے۔ رنگ مچھلی پھر
کانچ کے سنہری تلیوں باؤل میں آ گئی۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے یہ سمندر
دہانوں میں تیرنے والی مچھلی تو نہیں ہے۔

اس نے غلام رسول سے کہا۔

"میری ہتھکڑی کھول دو"

"یہ ہتھکڑی تو اب کبھی نہیں کھولوں گا۔ راستے بھر نہیں کھولوں" غلام رسول نے
ملجھن لہجے میں کہا۔

نریندر نے ایک لمحے کیلئے اس کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے کہا "اچھا میری
جیب میں ہاتھ ڈال کے دیکھو کیا ہے؟"

م رسول نے جیب میں ہاتھ ڈال کے دیکھا۔ ہیرے سے جڑا ہوا خوبصورت

اپنے دونوں بندھے ہوئے ہاتھوں میں اس کنگن کو اٹھا لیا۔ پھر اس
ں ہاتھ کھڑکی کے اندر ڈال کر اس کنگن کو راجکماری کے سامنے تپائی پر رکھ کر کہا
جکماری تم بھی اپنی ہتھکڑی پہن لو۔"

کہہ کر وہ جلدی سے آگے چلا گیا اور ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس گیا۔

اس ڈبے میں تاجدین بیٹھا تھا۔ اور جمال۔ حمیدہ۔ پنڈت جی اور ان کی بہو
اور چھوٹے چھوٹے بچے۔ بنارسی۔ بنسی اور بہت سے لوگ جن سے وہ پچھلے دو
زندگی میں واقف ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا استقبا
کیا۔ ہر شخص کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس بیٹھے۔ نندر ان کی اس گرم
اور مصفا اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔

جمال نے کہا۔

"مسز اکاٹ کہ تم میرے پاس آجاؤ میں تمہیں نوکری دلا دوں گا۔"

تاجدین بولا۔

"میرا گھر تمہارا اپنا گھر ہے۔ تم نے میری جان بچائی ہے۔ میری زندگی
اپنی زندگی سمجھو۔ میں ہر طرح سے تمہارا ہوں۔"

"تاجدین کی بیوی اس بھکارن کے بچے کو اپنی آغوش میں لیے بیٹھی"
اس کی گود میں کھیل رہا تھا۔ اور مسکرا رہا تھا۔ تاجدین کی بیوی ایک عجیب محبت
ماتا سے کچھ ایسے فخر اور غرور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے
بچہ نندو خود اس نے جنا ہو۔

گاڑی نے سیٹی دی اور چھک چھک کرکے آہستہ آہستہ چلنے لگی۔
چہروں پر اطمینان اور خوشی کی لہر دوڑ گئی مفتوحوں کی طرح۔

ی سے اندر آیا۔ اور اپنے ٹین کے ڈبے کو کھڑکھڑاتے ہوئے بولا۔

"کھٹی میٹھی گولیاں"

"کھٹی میٹھی گولیاں!"

یکایک اس کی آواز بھرا گئی آج وہ اس گاڑی میں اکیلا تھا اس صحرا میں بھائی کی روح کو چھوڑے جا رہا تھا۔ یکایک اس نے ڈبے کو اپنی چھاتی لگا لیا۔ اور کھڑکی سے بیتاب کر باہر جھانکنے لگا۔

الوداع جھنگ میرے بھائی!

کھٹی میٹھی گولیاں!

زندگی کھٹی بھی ہے اور میٹھی بھی۔ وہ ترش بھی ہے اور شیریں بھی گاڑی کی تیز ہو گئی تاجدین کی بیوی کی گود میں بیٹھا ان کا بچہ رونے لگا۔ زور زور سے رونے لگا۔

تاجدین کی بیوی نے حمیدہ سے سرگوشی میں کہا "اسے بھوک لگی ہے اور میں دودھ نہیں ہے۔

"پھر؟" حمیدہ نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

تاجدین کی بیوی بولی "پھر کیا؟ اس سے پہلے پنڈت جی کی بیوی اپنے خاوند سے چھپا کر اسے دودھ پلا دیا کرتی تھی۔ اب کیا کیا جائے۔ گاڑی میں تو سب اس گاڑی میں سب کے سامنے وہ اپنا دھرم کیسے بھرشٹ کر سکی۔ جی سامنے بیٹھے ہیں۔

ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے حمیدہ نے سرگوشی میں اسے جواب دیا۔ مگر بچہ چپ کیسے ہو اور تاجدین کی بیوی نے ہزار ہزار کوشش کی مگر بچہ تو بھوک سے بلک رہا تھا۔

دودھ کے بغیر کیسے خاموش ہوتا بچہ چپکارنے کے بعد بھی برابر روتا رہا۔ ایک کونے میں پنڈت کی بیوی لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے خاموشی سے اس کا بلکنا دیکھ رہی پھر وہ یکایک اپنی جگہ سے اٹھی گھبرا کر تاجدین کی بیوی کے پاس گئی جلدی سے اس نے تاجدین کی بیوی کی آغوش سے اس روتے ہوئے کو اپنی گود میں لے لیا اور وہیں سب کے سامنے کرتی اٹھا کر اسے دودھ پلانے لگی۔

پنڈت جی نے چلا کے کہا۔

"کیا کرتی ہو۔ کیا کرتی ہو یہ تو بھنگیوں کا بچہ ہے میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا" مگر پنڈتانی لمبا گھونگھٹ کاڑھے بچے کو اپنی چھاتی سے چمٹائے خاموش بیٹھی اور بچہ خوشی سے اوں اوں کرتا ہوا چسر چسر دودھ پی رہا تھا۔

نریندر کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے اس نے سوچا یہی تو ایسے لوگ ہیں۔ یہی تو میرے لوگ ہیں۔ انہیں پہ مجھے فخر ہے انہیں پر مجھے غرور ہے۔ اب میں انہیں چھوڑ کر کسی دوسری جگہ نہ جاؤں گا۔